الرسالہ
Al-Risāla
March 2000 • No. 280 • Rs. 10
عقل مند آدمی اس وقت بولتا ہے جب کہ
دوسرے بولنے والے چپ ہو چکے ہوں

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

کتاب	قیمت
تذکیر القرآن (مکمل)	400.00
اسلام: ایک تعارف	80.00
اللہ اکبر	45.00
پیغمبر انقلاب	50.00
مذہب اور جدید چیلنج	55.00
عظمت قرآن	35.00
عظمت اسلام	50.00
عظمت صحابہ	7.00
دین کامل	60.00
الاسلام	45.00
ظہور اسلام	50.00
اسلامی زندگی	40.00
احیاء اسلام	35.00
راز حیات	65.00
صراط مستقیم	40.00
خاتون اسلام	60.00
سوشلزم اور اسلام	50.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00
الربانیہ	40.00
کاروانِ ملت	45.00
حقیقت حج	30.00
اسلامی تعلیمات	35.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00
حدیث رسول	40.00
سفر نامہ (غیر ملکی اسفار)	85.00
راہ عمل	25.00
تعبیر کی غلطی	80.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00
عظمت مومن	7.00
اسلام ایک عظیم جدوجہد	5.00
تاریخ دعوت حق	5.00

کتاب	قیمت
مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00
ڈائری (جلد اول)	80.00
کتاب زندگی	65.00
اقوال حکمت	25.00
تعمیر کی طرف	8.00
تبلیغی تحریک	20.00
تجدید دین	25.00
عقلیات اسلام	35.00
قرآن کا مطلوب انسان	8.00
دین کیا ہے؟	7.00
اسلام دین فطرت	7.00
تعمیر ملت	7.00
تاریخ کا سبق	7.00
فسادات کا مسئلہ	5.00
انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00
تعارف اسلام	5.00
اسلام پندرہویں صدی میں	5.00
راہیں بند نہیں	12.00
ایمانی طاقت	7.00
اتحاد ملت	7.00
سبق آموز واقعات	7.00
زلزلہ قیامت	10.00
حقیقت کی تلاش	8.00
پیغمبر اسلام	5.00
آخری سفر	7.00
اسلامی دعوت	7.00
حل یہاں ہے	10.00
سچا راستہ	8.00
دینی تعلیم	7.00
امہات المومنین	20.00
تصویر ملت	85.00

کتاب	قیمت
دعوت اسلام	50.00
دعوت حق	40.00
نثری تقریریں	80.00
دین انسانیت	60.00
فکر اسلامی	50.00
شتم رسول کا مسئلہ	50.00
طلاق اسلام میں	5.00
مضامین اسلام	60.00
حیات طیبہ	7.00
باغ جنت	7.00
نار جہنم	7.00
خلیج ڈائری	10.00
رہنمائے حیات	7.00
تعدد ازواج	7.00
ہندستانی مسلمان	50.00
روشن مستقبل	7.00
صوم رمضان	7.00
اسلام کا تعارف	4.00
علما اور دور جدید	8.00
سفر نامہ اسپین و فلسطین	60.00
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	12.00
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8.00
یکساں سول کوڈ	5.00
اسلام کیا ہے؟	8.00
میوات کا سفر	35.00
قیادت نامہ	35.00
مطالعہ سیرت	60.00
منزل کی طرف	4.00
اسباق تاریخ	85.00

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مارچ 2000 شمارہ نمبر 280

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 460
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577.
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel/Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

فہرست

دینی تقاضے 4
محتاط روش 5
سرچشمۂ اعتماد 6
ایک حدیث 8
عمل اور نیت 9
یہ فرق کیوں 11
حضرت لبیدؓ 12
موت کی دستک 13
دل جیتنا 14
انتظار بھی حل ہے 15
انسانی محدودیت 16
ہرقل کا واقعہ 17
مسئلہ اور غم 18
خطرہ کہاں ہے 19
ترقی کے مواقع 20
کامیاب فارمولا 21
صدی کی شخصیت 23
ملک کی تعمیر اور مسلمان 26
اسلام کے نام پر غیر اسلام 30
ایک خط 36
سوال و جواب 39
توجیہہ یا بد دیانتی 44
خبرنامہ اسلامی مرکز ۴۵ 45

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi

دینی تقاضے

۱۔ دین میں پہلی چیز ایمان ہے۔ ایمان خدا کی معرفت کا نام ہے۔ ایک انسان پر جب یہ حقیقت کھلتی ہے کہ خدا اس کا رب ہے اور وہ اس کا بندہ ہے اور خدا نے اس کی ہدایت کے لئے محمد بن عبداللہ کو اپنا رسول بنا کر اس کے پاس بھیجا ہے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ یہی ایمان ہے اور اسی کو کلمۂ اسلام کا اقرار کہا جاتا ہے۔

۲۔ ایمان کی حقیقت سینہ میں اترنے کے فوراً بعد یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے خالق و مالک کے آگے جھک جاتا ہے۔ وہ اپنے تمام بہترین احساسات کو خدا کی طرف موڑتے ہوئے اس کا پرستار بن جاتا ہے۔ اسی کا نام شریعت میں عبادت ہے۔

۳۔ ایسے انسان کا سابقہ جب بندوں سے پڑتا ہے تو وہ عین اپنے مزاج کے تحت ہر ایک سے تواضع کے ساتھ پیش آتا ہے۔ وہ ہر ایک کا خیر خواہ بن جاتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ ہمیشہ انصاف کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اس سے کسی کو غیر انسانی سلوک کا تجربہ نہیں ہوتا۔ یہی وہ روش ہے جس کا نام اسلامی اخلاق ہے۔

اسلامی اخلاق کے اصول پر قائم رہنے کے لئے صبر انتہائی طور پر ضروری ہے۔ جو آدمی صبر کرنے کے لئے تیار نہ ہو وہ لوگوں کے ساتھ اسلامی اخلاق برتنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

۴۔ جس آدمی کے اندر ایمان کی کیفیت پیدا ہو جائے وہ اپنے قریبی ماحول کے بارہ میں غیر جانبدار بن کر رہ نہیں سکتا۔ اس کا احساس مجبور کرتا ہے کہ وہ برا کرنے والوں کو برائی کرنے سے روکے اور لوگوں کو بھلائی کا طریقہ اختیار کرنے کی ترغیب دے۔ اسی کا نام شریعت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

۵۔ آخری چیز دعوت الی اللہ ہے۔ یعنی عام انسانوں کو خدا کے تخلیقی نقشہ سے باخبر کرنا۔

محتاط روش

- عن اوس بن شرحبیل انه سمع رسول الله علیه وسلم یقول: من مشی مع ظالم لیقویه و هو یعلم انه ظالم فقد خرج من الاسلام (مشکاۃ المصابیح ۳/۱۴۲۰) اوس بن شرحبیل کہتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص ظالم کے ساتھ چلے تاکہ اس کو تقویت حاصل ہو، اور وہ جانتا ہو کہ وہ ظالم ہے، تو ایسا شخص اسلام سے نکل گیا۔

عن ابراھیم بن میسرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی ھدم الاسلام (مشکاۃ ۱/۶۶) ابراہیم بن میسرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص بدعت والے کی توقیر کرے تو اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد دی۔

کسی آدمی کے برا آدمی ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ براہِ راست برائی میں ملوث ہو۔ مثلاً وہ خود برا کام کرے یا برا کام کرنے والے کا باقاعدہ ساتھی بن جائے۔ جو لوگ اس طرح براہ راست انداز میں ملوث ہوں ان کا برا ہونا ایک معلوم اور مسلّم بات ہے۔ تاہم اسلام کی نظر میں صرف وہی شخص برا نہیں جو ذاتی طور پر اور براہِ راست طور پر برائی میں ملوث ہو۔ اسلام کے نزدیک وہ شخص بھی یکساں طور پر برا ہے جو بالواسطہ انداز میں برائی کے عمل میں ملوث ہوتا ہے۔

اجتماعی زندگی میں آدمی کا ہر عمل یا تو کسی کے موافق ہوتا ہے یا کسی کے مخالف، ہر آدمی اپنے قول و عمل سے ایک روش کی تائید کرتا ہے اور دوسری روش کی تردید، خواہ یہ تائید و تردید براہ راست ہو یا بالواسطہ۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ جب بھی وہ کسی معاملہ میں بولے یا کوئی کارروائی کرے تو بولنے یا کرنے سے پہلے یہ سوچے کہ اس کے قول یا عمل کے ذریعہ کس کی حمایت ہوتی ہے اور کس کی مخالفت۔ اور وہ وہی کرے جس سے اہل حق کی حمایت ہوتی ہو۔ ہر حال میں وہ اہل باطل کی حمایت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے حتّٰی کہ بالواسطہ حمایت سے بھی۔

سرچشمۂ اعتماد

۲۷ جنوری ۲۰۰۰ کو دہلی میں میرے ساتھ ایک جانکاہ ذاتی حادثہ پیش آیا۔ میرا ایک نوجوان پوتا سڑک کے ایک حادثہ میں اچانک وفات پا گیا۔ ۲۸ جنوری کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد اوکھلا کی مسجد میں نماز جنازہ ہوئی اور جامعہ کے قبرستان میں اس کو دفن کیا گیا۔

مرحوم خالد (فرزند ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں ڈائرکٹر، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ عربک اسٹڈیز) ایک انتہائی ذہین نوجوان تھا۔ وہ آرکٹیکچر میں زیر تعلیم تھا۔ ہر لحاظ سے وہ ایک صالح اور لائق نوجوان تھا۔ گویا کہ وہ ایک کلی تھی جس کو ابھی پھول بننا باقی تھا۔ مگر اس کے لئے مقدر تھا کہ وہ پھول بننے سے پہلے ہی موجودہ دنیا سے رخصت ہو جائے۔ جمعہ کی نماز کے بعد جب اس کی میت روانہ ہوئی اور میں نے میت کے پلنگ کو کندھا دیا تو میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میری زبان سے نکلا: یہ کیسی عجیب بات ہے کہ بوڑھا دادا نوجوان پوتے کے جنازہ کو کندھا دے رہا ہے۔

مرحوم خالد کی میت جب قبر کے اندر رکھی جا چکی اور حسب قاعدہ میں نے اپنے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اس میں مٹی ڈالتے ہوئے کہا: منها خلقناكم وفيها نعيدكم و منها نخرجكم تارةً اخرى ۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے قبر سے مرحوم نوجوان کی پر مسرت آواز میرے کانوں میں آرہی ہے: دادا آپ رو رہے ہیں، میں تو دیکھئے، جنت کے باغوں میں کھیل رہا ہوں۔ مرحوم خالد کی وفات کے بعد اگلی رات کو میری لڑکی ڈاکٹر فریدہ نے خواب دیکھا کہ وہ مجھ سے کہہ رہی ہے: ابا دیکھئے خالد تو بول رہے ہیں۔

یہ اسلام کی تعلیم کا کرشمہ تھا۔ اسلام میں بتایا گیا ہے کہ معصوم بچے بلا حساب کتاب جنت میں داخل کر دیئے جاتے ہیں۔ مرحوم خالد ابھی معصومیت کی عمر میں تھا، وہ ابھی مسؤلیت کی عمر میں نہیں پہنچا تھا۔ مزید یہ کہ مومن کے لئے حادثہ یا ہدم کی موت کو شہادت کی موت کہا گیا ہے (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب بیان الشہداء) اس بنا پر انشاء اللہ یقینی ہے کہ مرحوم کی موت اس

کے لئے جنت میں داخلہ کا دروازہ تھی۔ ہمارے لئے وہ ایک سوگواری کا دن تھا، مگر مرحوم کے لئے وہ جنت میں داخلہ کا دن۔

یہ انسان کے لئے اسلام کا ایک عظیم تحفہ ہے۔ اسلام کی تعلیمات کا یہ ایک نادر پہلو ہے کہ وہ بدترین مایوسی کے وقت بھی امید کا پیغام دیتا ہے۔ بحران کے سنگین ترین لمحات میں وہ انسان کے لئے سرچشمۂ اعتماد بن جاتا ہے۔ وہ کھونے کی حالت میں بھی پانے کا راز بتاتا ہے۔ ایک غیر اسلامی ذہن جہاں محسوس کرتا ہے کہ اس کی زندگی کا سفر محرومیوں کے ساتھ ختم ہو گیا، وہاں اسلام اپنے وفاداروں کو یہ خوش خبری دیتا ہے کہ نہیں، یہ تمہارے لئے خاتمہ نہیں، بلکہ یہ تمہارے لئے نئے بہتر دور کا آغاز ہے۔ یہ موت نہیں بلکہ زندگی ہے۔ مومن کے لئے محرومی کی ہر کہانی یافت کی کہانی ہے۔ زندگی کے طوفان خیز لمحات میں بھی اللہ کا اعتماد اس کے لئے اتھاہ سہارا ہوتا ہے۔

مومن کی ہر رات ایک نئی صبح کا آغاز ہے۔ مومن کے لئے اس کا ایمان ایک اتھاہ سرچشمۂ اعتماد ہے۔ مایوسی اور محرومی غیر مومن کے لئے ہو سکتی ہے مگر مومن کے لئے اس دنیا میں نہ مایوسی کا سوال ہے اور نہ محرومی کا سوال۔

یہ بات صحیح مسلم کی ایک روایت میں اس طرح آئی ہے: عجباً لأمر المؤمن ان امره كله له خير، وليس ذلك لأحد الا للمؤمن، ان اصابته سراء شكر فكان خيراً له، و ان اصابته ضراء صبر فكان خيراً له (مشکاۃ المصابیح ۱۴۵۸ ر ۳) یعنی مومن کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ اس کا ہر معاملہ اس کے لئے خیر کا سبب ہوتا ہے۔ اور یہ چیز مومن کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔ اگر اس کو خوشحالی پہنچتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے۔ اس طرح خوش حالی اس کے لئے خیر بن جاتی ہے اور اگر اس کو نقصان پہنچتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے اس طرح نقصان اس کے لئے خیر بن جاتا ہے۔

زندگی ناقابلِ برداشت کو برداشت کرنے کا امتحان ہے، اور اسلام ہمیں وہ طاقت دیتا ہے جس کے ذریعہ ہم اس ناقابل برداشت کو برداشت کر سکیں۔

ایک حدیث

صحیح مسلم کا آغاز کتاب الایمان سے ہوتا ہے۔ اس کے ایک باب کا عنوان یہ ہے کہ جو شخص قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے اس کے لئے جہنم کی وعید ہے (باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین فاجرة بالنار):

عن ابی امامة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: من اقتطع حق امریٔ مسلم بیمینه فقد اوجب الله له النار وحرم علیه الجنة. فقال له رجل وان کان شیئاً یسیراً یا رسول الله قال: وان کان قضیباً من اراكٍ (الجامع لاحکام القرآن ٤/١٢٠)

ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان آدمی کا مال قسم کھا کر مار لے تو اللہ اس کے لئے آگ کو واجب کر دیتا ہے۔ اور اس پر جنت حرام کر دیتا ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول، اگر چہ وہ کوئی معمولی چیز ہو۔ آپ نے فرمایا کہ اگر چہ وہ پیلو کی ایک ٹہنی کیوں نہ ہو۔

دوسرے کی چیز ہڑپ کرنے کے بعد قسم کھانا دراصل اپنے آپ کو جائز ثابت کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ آدمی کبھی قسم کے ذریعہ سے اپنی تبریر کرتا ہے اور کبھی دوسرے ذریعہ سے۔ آدمی جھوٹے الفاظ بول کر انسانوں کے سامنے اپنی سرخروئی باقی رکھنا چاہتا ہے، اس لئے وہ قسم جیسی تدبیریں اختیار کرتا ہے۔ مگر عین اس وقت جب کہ آدمی اپنے آپ کو اہل دنیا کے سامنے پاکباز ثابت کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوتا ہے، اللہ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے کہ اس کو جہنمی انسانوں کی فہرست میں لکھ لو۔ ناحق کسی کی چیز لینا برا ہے۔ مگر یہ اور بھی زیادہ برا ہے کہ آدمی جھوٹے الفاظ بول کر اپنی اس برائی کو بھلائی ثابت کرے۔ ایسا کرنا خدا پر جسارت ہے۔ یہ جرم پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ ایسا آدمی اپنے بارہ میں ثابت کر رہا ہے کہ وہ اخلاقی کمزوری کے ساتھ بے حسی اور ہٹ دھرمی اور خدا سے کامل بے خوفی جیسے شدید تر امراض میں مبتلا ہے۔

عمل اور نیت

صحیح البخاری کا پہلا باب اگرچہ آغاز وحی (کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ مگر اہمیت کی بنا پر اس میں سب سے پہلی حدیث نیت سے متعلق درج کی گئی ہے۔ امام البخاری اپنا سلسلۂ سند بتاتے ہوئے روایت کرتے ہیں کہ علقمہ بن وقاص اللیثی کہتے ہیں کہ میں نے عمر بن الخطاب کو منبر پر یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔ ہر آدمی کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس آدمی کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے تھی تو اس کی ہجرت اسی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔

کوئی عمل، خواہ بظاہر وہ دینی کیوں نہ ہو، اس کا بدلہ آدمی کو اسی نیت کے اعتبار سے ملتا ہے جس کے تحت اس نے وہ عمل کیا تھا۔ گویا عمل کا مدار آدمی کی اپنی حالت نفسی پر ہے نہ کہ خود عمل کی شکل ظاہری پر۔

مثلاً کلمہ کے الفاظ دہرا کر آدمی مومن بنتا ہے۔ مگر ایمان کا مدار محض کلمہ کے صحت تلفظ پر نہیں ہے، بلکہ ایمان کا اقرار کرنے والے آدمی کی قلبی کیفیت پر ہے۔ نماز کا مدار اس کے مسائل ظاہری کی تعمیل پر نہیں ہے بلکہ خود نمازی کے باطنی خشوع پر ہے۔ انفاق کا مدار اس کی مقدار پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ آدمی نے اپنا انفاق خالص اللہ کے لئے کیا تھا یا اس میں کوئی اور مقصد شامل تھا، وغیرہ۔

آدمی کی جیسی نیت ہو اسی کے لحاظ سے اس کی پسند بنتی ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی کام کی طرف جھکتا ہے جس میں اس کی نیت پوری ہوتی ہو۔ اس کے علاوہ جو کام ہیں ان کی طرف اسے رغبت نہیں ہوتی۔ شہرت چاہنے والا آدمی انھیں کاموں کی طرف دوڑتا ہے جن میں نمائشی پہلو موجود ہو۔ ایک مادیت پسند آدمی انھیں میدانوں میں سرگرم ہوتا ہے جس میں

اسے مالی فائدہ پانے کی امید ہو۔ایک قیادت کا شائق آدمی انھیں چیزوں میں دھوم مچاتا ہے جن کے ذریعہ یہ امید ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کا قائد بن جائے گا۔

دنیا کے لئے کرنے والے کا عمل دنیا ہی میں رہ جائے گا اور جو شخص آخرت کے لئے عمل کرے وہ اپنے عمل کا انجام مزید اضافہ کے ساتھ آخرت میں پائے گا۔

قرآن و حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جو آدمی صالح نیت کے ساتھ عمل کرے اسی کا عمل اللہ تعالی کے یہاں مقبول ہوتا ہے۔اور جس آدمی کی نیت صالح نہ ہو اس کا بظاہر نیک عمل بھی خدا کے یہاں قبولیت کا درجہ حاصل نہیں کرے گا۔

مثلاً ایک آدمی دکھاوے کے لئے مال خرچ کرے تو اس پر اس کے لئے کوئی ثواب نہیں ہے۔اسی طرح کوئی آدمی دکھاوے کے لئے عبادت کرے تو وہ بھی اس کو کسی ثواب کا مستحق نہیں بنائے گی۔ حتیٰ کہ اگر کوئی آدمی شہرت کے لئے جہاد کرے تو ایسا جہاد بھی خدا کی نظر میں بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔

اس معاملہ کے دو درجے ہیں۔ایک کو شعوری اور دوسرے کو غیر شعوری کہا جاسکتا ہے۔شعوری درجہ یہ ہے کہ آدمی پیشگی طور پر یہ سوچ کر کوئی کام کرے کہ اس کے ذریعہ سے اس کو دنیوی فائدے حاصل ہوں گے۔لوگوں میں اس کی عزت اور مقبولیت بڑھے گی۔

اس معاملہ کی غیر شعوری صورت یہ ہے کہ آدمی پیشگی طور پر اور بالکل سوچ سمجھ کر تو ایسا کام نہ کرے مگر اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ ایسا بن گیا ہو کہ اس کو صرف نمائشی کاموں میں دلچسپی ہو۔ غیر نمائشی کام اس کو اہم نظر نہ آئیں، اس بنا پر وہ اپنے آپ کو اس میں شریک بھی نہ کرے۔ اس کو مادی فائدے والے کاموں سے رغبت ہو اور غیر مادی قسم کے کاموں سے بے رغبتی۔ایسا آدمی بھی وسیع تر تقسیم کے اعتبار سے مذکورہ زمرہ ہی میں شامل ہے۔

یہ فرق کیوں

یہود کا جرم قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے پچھلے پیغمبروں کو مانا لیکن انھوں نے محمد ﷺ کا انکار کر دیا۔ اس کے بر عکس صحابہ کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے کہ وہ تمام پیغمبروں کو مانتے ہیں۔ وہ جو پہلے آئے اور وہ جو اب محمد بن عبد اللہ کی صورت میں ان کے سامنے موجود ہیں۔ یہود کا اور صحابہ کا یہ فرق محض "فہرست" کا فرق نہ تھا۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ یہود کی فہرست انبیاء عددی معنوں میں غیر مکمل تھی اور صحابہ کی فہرست انبیاء عددی معنوں میں مکمل۔

یہ فہرست کا معاملہ نہیں تھا بلکہ حقیقت کا معاملہ تھا۔ یہود کا ماننا اندھی تقلید کی بنیاد پر ماننا تھا اور صحابہ کا ماننا جوہر شناسی کی بنیاد پر ماننا۔ جو انبیاء تاریخ کے نتیجہ میں یہود کی قومی روایات میں شامل ہو چکے تھے ان کو انھوں نے مان لیا لیکن معاصر پیغمبر جو ان کی قومی روایات میں شامل نہیں ہوا تھا اس کو وہ پہچان نہ سکے، اس لئے وہ اس کو ماننے پر بھی تیار نہیں ہوئے۔ اول الذکر نبیوں کو ماننے کے لئے تقلید آباء کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہ تھی اس لئے ان کو انھوں نے مان لیا۔ مگر دوسرے پیغمبر کو ماننے کے لئے ذاتی طور پر شعوری دریافت کی ضرورت تھی اور یہاں وہ ناکام ہو گئے۔

مذہب یہود دراصل آبائی مذہب کا دوسرا نام ہے۔ اور مذہبِ صحابہ شعوری مذہب کا دوسرا نام۔ ہوتا یہ ہے کہ ابتدائی دور میں کچھ لوگ دعوت حق سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان پر حقیقت کھلتی ہے۔ وہ اپنے ذاتی علم کے تحت ایک شعوری فیصلہ کرتے ہیں۔ ان کی ذات کے اندر ایک نفسیاتی انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ اس کے زیر اثر وہ ایک زندگی کو بالقصد چھوڑتے ہیں اور دوسری زندگی کو بالقصد اختیار کرتے ہیں۔

پہلا دور شعوری ایمان کا دور ہوتا ہے، جب کہ بعد کے دور کے لوگ اس لئے مومن ہوتے ہیں کہ ان کے باپ دادا مومن تھے۔ وہ قومی اور نسلی تعلق کی بنا پر مومن ہوتے ہیں نہ کہ کسی ذہنی انقلاب کے نتیجہ میں مومن بنتے ہیں۔

حضرت لبیدؓ

لبید بن ربیعہ بن مالک العامری (وفات ۴۱ھ) قدیم عرب کے ایک مشہور شاعر تھے۔ ان کا شمار اصحاب المعلقات میں سے ہوتا ہے۔ ہجرت کے بعد انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد انھوں نے شاعری چھوڑ دی۔ کہا جاتا ہے کہ قبول اسلام کے بعد انھوں نے صرف ایک شعر کہا تھا جو یہ ہے:

ما عاتب المرء الكريم كنفسه　　　والمرء يصلحه الجليس الصالح

عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں ایک بار حضرت لبیدؓ سے کہا کہ اپنے کچھ اشعار سنائیے۔ حضرت لبید نے جواب دیا کہ اللہ نے جب مجھ کو بقرۃ اور آل عمران جیسی سورتوں کی تعلیم دی تو اس کے بعد میرے لئے مناسب نہیں کہ میں شعر کہوں (ما كنت لاقول شعراً بعد ان علّمنى الله البقرة وآل عمران) ابن عبد البر، الاستیعاب۔

حضرت لبید نے اپنے شعر میں جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ شریف آدمی احتساب غیر کے بجائے احتساب خویش کے معاملہ میں زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی غلطی پر گرفت کرتے ہوئے نرمی کا انداز اختیار کر سکتا ہے مگر جب معاملہ خود اپنی غلطی کا ہو تو وہ اس کے لیے بے رحم محاسب بن جاتا ہے۔

شعر کے دوسرے مصرعہ میں انھوں نے صحبت کی اہمیت بتائی ہے، آدمی اگر زیادہ دیر تک برے کی صحبت اختیار کرے تو اندیشہ ہے کہ وہ بھی برا بن جائے اور جب آدمی اچھے انسان کی صحبت اختیار کرتا ہے تو اس کی صحبت کے اثر سے وہ بھی ایک اچھا آدمی بن جاتا ہے۔

یہ بات بظاہر قرآن کے مقابلہ میں ہے مگر وسیع تر معنی میں اس کا تعلق دوسری حقیقتوں سے بھی ہے۔ ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے اس کا تعلق قرآن کے سامنے خاموشی اختیار کرنے سے ہے۔ اور وسیع تر انطباق کے لحاظ سے ہر حق کے سامنے اپنی زبان بند کر لینے سے۔

موت کی دستک

موت ہر آدمی کے گھر پر دستک دیتی ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ موت پہلی دستک کے بعد ہی گھر مین داخل ہو جاتی ہے اور آدمی کی روح کو قبض کر لیتی ہے۔ وہ اچانک دنیا کے امتحان گاہ سے نکال کر آخرت میں پہنچادیا جاتا ہے جہاں وہ اپنے اعمال کا انجام پائے۔

اچانک موت کا یہ معاملہ مختلف صورتوں میں پیش آتا ہے۔ مثلاً دل کا تیز دورہ پڑا اور فوری طور پر آدمی کی موت واقع ہو گئی۔ سڑک پر سخت حادثہ پیش آیا اور ایک لمحہ کے اندر زندہ انسان مردہ انسان میں تبدیل ہو گیا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان صحت کی حالت میں رات کو سویا اور صبح ہوئی تو بستر پر صرف اس کی بے جان لاش پڑی ہوئی تھی۔ اچانک موت بلاشبہ بے حد سنگین موت ہے کیونکہ آدمی کو اس میں یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ موت سے پہلے اپنی غلطیوں کی تلافی کر سکے۔

دوسری صورت وہ ہے جب کہ موت بار بار ایک آدمی کے گھر پر دستک دیتی ہے لیکن اندر داخل ہونے سے پہلے ہی وہ لوٹ جاتی ہے۔ اس واپسی کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً آدمی بیمار ہو کر اچھا ہو جائے۔ سخت حادثہ پیش آجانے کے باوجود وہ موت سے بچ جائے۔ اس کے اوپر حملہ کیا جائے لیکن حملہ آور کا نشانہ خالی چلا جائے، وغیرہ۔

یہ دوسری قسم آدمی کو بار بار موقع دیتی ہے کہ وہ اپنے بارے میں سوچے۔ وہ اپنی زندگی پر نظر ثانی کرے اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کر کے زیادہ صحیح زندگی گزارنے کا فیصلہ کرے۔ موت کا آپ کے دروازہ پر دستک دے کر چلا جانا گویا اس بات کا الارم ہے کہ ہوشیار ہو جاؤ۔ جلد ہی تمہارا آخری وقت آنے والا ہے۔ اپنی اصلاح کر لو، اس سے پہلے کہ اصلاح کا وقت ہی باقی نہ رہے۔ ہر آدمی موت کی زد میں ہے۔ کوئی بھی چیز آدمی کو موت سے بچانے والی نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی آج مرنے والا ہے اور کوئی وہ ہے جس پر کل کے دن موت آئے گی۔ موت کی یاد سے بہتر کوئی معلم انسان کے لئے نہیں۔

دل جیتنا

زندگی کا اصول ایک لفظ میں یہ ہے کہ ـــــ جیسا دینا ویسا پانا۔ اگر آپ دوسروں کو نفرت دے رہے ہوں تو آپ کو بھی دوسروں سے نفرت ملے گی۔ اگر آپ کے پاس دوسروں کو دینے کے لئے محبت کا تحفہ ہے تو دوسروں کی طرف سے بھی آپ کو محبت کا تحفہ دیا جائے گا۔ اگر آپ اپنے سماج میں مسائل کو حل کرنے کا ذریعہ بنے ہوئے ہوں تو پورا سماج آپ کو اپنے سردار کے روپ میں دیکھنے لگے گا۔

خدا نے خدمت اور نفع بخشی میں بے پناہ کشش رکھی ہے۔ اس میں یہ طاقت ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کر سکے۔ ایسا آدمی لوگوں کے درمیان اپنے آپ مقبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کو دوسروں سے وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو وہ چاہتا تھا، کیوں کہ اس نے بھی دوسروں کو وہ سب کچھ دے دیا تھا جن کو وہ اپنے لئے چاہتے تھے۔

دوسروں کے خیر خواہ بن جایئے اور پھر آپ کو دوسروں سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ دسروں کے کام آیئے اور پھر آپ کا بھی کوئی کام اٹکا ہوا نہیں رہے گا۔

اس دنیا میں ہر آدمی مجبور ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارے، یہاں کسی کے لئے بھی تنہا زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں بار بار یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ رہنے کا کامیاب طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لوگوں کو جھکانے کی کوشش نہ کیجئے بلکہ خود جھک جایئے۔ لوگوں سے لینے کی کوشش نہ کیجئے بلکہ دینے والے بنئے۔ شکایتوں کو مسئلہ نہ بنایئے بلکہ شکایتوں کو بھول جایئے۔ اختلاف کو ٹکراؤ کا موضوع نہ بنایئے بلکہ اختلاف کے باوجود لوگوں کے ساتھ اچھا معاملہ کیجئے۔ کوئی شخص بظاہر آپ کا دشمن نظر آئے تب بھی اس سے نفرت نہ کیجئے۔ یہی دل کو جیتنے کا طریقہ ہے اور جب دل کو جیت لیا جائے تو اس کے بعد کوئی اور چیز جیتنے کے لئے باقی نہیں رہتی۔

انتظار بھی حل ہے

مختلف زبانوں میں جو مثلیں مشہور ہیں وہ دراصل لمبے انسانی تجربات کے بعد بنی ہیں۔ ان میں سے ہر مثل کامیابی کا ایک یقینی فارمولہ ہے۔ اسی طرح کی ایک انگریزی کہاوت یہ ہے ـــــ انتظار کرو اور دیکھو:

Wait and see.

امریکہ کا مشہور رائٹر ہنری ڈیوڈ تھارو (Henry David Thoreau) ۱۸۱۷ میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۲ میں اس نے وفات پائی۔ اس کا ایک قول ہے کہ ہیرو وہ ہے جو یہ جانے کہ کہاں انتظار کرنا ہے اور کہاں جلدی کرنا ہے۔ ہر بھلائی اس انسان کے حصہ میں آتی ہے جو دانش مندانہ طور پر انتظار کرے:

The hero knows how to wait as well as to make haste.
All good abides with him who waiteth wisely.

زندگی میں بعض اوقات ایسے لمحے آتے ہیں جب کہ آدمی کو فوری طور پر ایک فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ تاہم اگر آدمی فوری فیصلہ کرنے میں چوک جائے تو اس کے بعد اس کے لئے جو چیز ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ گھبرا کر یا جلد بازی میں بے فائدہ کارروائیاں کرنے لگے۔ اب اس کو انتظار کرنا چاہئے۔ عقلمند وہ ہے جو اس فرق کو جانے کہ کب فوری فیصلہ لینا ہے اور کب معاملہ کو انتظار کے خانہ میں ڈال دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انتظار بھی ایک عمل ہے۔ انتظار کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ انتظار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنے معاملہ کو فطرت کے نظام کے حوالہ کر دیا۔ وہ خدا کے فیصلہ کا منتظر بن گیا۔

اگر وقت پر صحیح فیصلہ لینا کامیابی ہے تو ناموافق حالات میں انتظار کی پالیسی اختیار کرنا بھی کامیابی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ایک کا نتیجہ حال میں نکلتا ہے اور دوسرے کا نتیجہ مستقبل میں۔

انسانی محدودیت

امریکہ کے سفر میں مجھے ایک تاجر کے مکان پر شام کے کھانے کے لئے بلایا گیا۔ یہ ایک بڑے تاجر تھے۔ ان کا تجارتی سرمایہ ایک سوملین ڈالر تھا۔ کھانے کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ تاجر کی اہلیہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ مجھے ایک کمرہ میں لے جایا گیا جہاں دو کرسیاں تھیں۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد خاتون آئیں اور وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں۔

یہ ایک مغربی خاتون تھیں۔ وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھی رہیں۔ میں نے رسمی گفتگو شروع کی تب بھی وہ کچھ نہ بول سکیں۔ آخر کار جو ہوا وہ یہ تھا کہ وہ بے اختیار رونے لگیں اور انگریزی میں یہ کہہ کر چلی گئیں کہ: مولانا صاحب، ہمارے لئے دعا کیجئے۔

یہ کوئی انفرادی واقعہ نہیں۔ یہی ان تمام لوگوں کی کہانی ہے جن کو خوشحال کہا جاتا ہے۔ آپ کسی بھی ایسے شخص کو لیجئے جو آپ کو مادی اعتبار سے کامیاب نظر آتا ہو اور پھر اس کو قریب سے جاننے کی کوشش کیجئے۔ آپ پائیں گے کہ بظاہر ایک پر رونق زندگی کے پیچھے صرف ایک غمناک روح چھپی ہوئی ہے۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ اس دنیا میں آدمی یہ تو کر سکتا ہے کہ وہ مادی سامان اپنے پاس اکٹھا کر لے۔ مگر وہ اپنی اس کمی کو دور نہیں کر سکتا کہ اپنی پیدائشی محدودیت کی بنا پر وہ پر لذت چیزوں سے محظوظ ہونے کی طاقت اس کے اندر نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں اصل مسئلہ سامان عیش کی فراہمی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اپنے تخلیقی ضعف (النساء ۲۸) کی بنا پر انسان یہ استعداد ہی نہیں رکھتا کہ وہ سامان عیش سے انجوائے کر سکے۔

انسان اپنی ساری طاقت مادی خوشی کے حصول میں لگا دیتا ہے۔ حالانکہ موجودہ دنیا میں مادی خوشی کا حصول سرے سے ممکن ہی نہیں۔ موجودہ دنیا جنت کی پہچان (محمد ۶) کے لئے ہے، وہ جنت کی تعمیر کے لئے نہیں۔

ہرقل کا واقعہ

۲۰ اگست ۶۳۶ء کو ایک فیصلہ کن واقعہ ہوا جو تاریخ میں دریائے یرموک کی جنگ (Battle of the Yarmuk River) کے نام سے مشہور ہے۔ یرموک ایک دریا کا نام ہے جو شام اور اردن کے درمیان واقع ہے۔ مذکورہ تاریخ کو یہاں عربوں اور رومیوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ عرب فوج کے سردار خالد بن ولید تھے، اور رومی فوج کی قیادت تذارق (Theodorus) کر رہا تھا جو شہنشاہ ہرقل کا بھائی تھا۔

اس جنگ میں رومی فوج کو مکمل شکست ہوئی۔ خود تذارق قتل کر دیا گیا۔ یہ جنگ اس پورے علاقہ کے لئے فیصلہ کن تھی، چنانچہ اس کے بعد پورا شام تقریباً بلا مقابلہ عربوں کے قبضہ میں آگیا۔ یرموک کی شکست کی اس اہمیت سے شہنشاہ ہرقل بخوبی واقف تھا جو اس وقت حمص (شام) میں تھا۔ اس کے بعد وہ حمص سے روانہ ہو گیا۔ مورخ بلاذری کی روایت کے مطابق، اس وقت اس کی زبان پر یہ کلمہ تھا: سلام علیك یا سوریا، سلاما لا لقاء بعده (اے شام، تجھ کو آخری سلام، اب تجھ سے میری ملاقات نہیں ہوگی)

ہر چیز جو انسان کو ملی ہوئی ہے وہ آخر کار اس کا ساتھ چھوڑنے والی ہے۔ موت سے پہلے یا موت کے وقت۔ مگر انسان آخر وقت تک چیز کو اپنی چیز سمجھتا ہے۔ وہ سوچ نہیں پاتا کہ کوئی چیز اس کی اپنی نہیں۔ ہر چیز خدا کی چیز ہے۔ وہ جب تک چاہے کسی کے پاس رکھے، اور جب چاہے چھین لے۔

آدمی جو کلمہ ملک چھن جانے کے بعد کہتا ہے، اگر وہی کلمہ وہ ملک چھننے سے پہلے کہے تو وہ اس کے نامۂ اعمال میں ایک قیمتی عمل کے طور پر لکھا جائے۔ مگر آدمی اس حقیقت شناسی کا ثبوت نہیں دیتا۔ ہر آدمی چھننے کے بعد کہتا ہے نہ کہ چھننے سے پہلے۔ اور چھننے کے بعد کہنا کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

مسئلہ اور غم

کوئی آدمی جب بھی کسی مسئلہ سے دوچار ہوتا ہے تو ایسا ہمیشہ فطرت کے قانون کے تحت ہوتا ہے۔ لیکن مسئلہ کو اپنے لئے ایک غم بنالینا یہ انسان کا اپنا اضافہ ہے۔ ابتدائی طور پر کوئی مسئلہ صرف ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ لیکن جب آپ مسئلہ پیش آنے پر غم میں مبتلا ہو جائیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ نے فطرت کے واقعہ پر اپنی طرف سے ایک غیر مطلوب اضافہ کر دیا۔

مسائل کے مقابلہ میں یہی انسان کی اصل غلطی ہے۔ یہ غلطی بے حد سنگین ہے کیونکہ وہ مسئلہ کے حل میں معاون تو نہیں بنتی، البتہ وہ اس کے حل میں ایک فیصلہ کن رکاوٹ بن جاتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی رسی میں گرہ پڑنے کے بعد اس کو اور زیادہ کس دیا جائے۔

آدمی کو یہ بات جاننا چاہئے کہ اس دنیا میں وہ تنہا نہیں ہے یہاں بہت سے دوسرے لوگ ہیں جن کے درمیان اس کو زندگی گزارنا ہے۔ اس دنیا میں انسان کی حیثیت گویا ایک بہت بڑی مشین کے اندر ایک چھوٹے پرزہ کی ہے یا وہ ایک بے حد مصروف سڑک پر ایک راہگیر ہے۔

انسانی زندگی کی یہی مخصوص نوعیت ہے جو مسائل پیدا کرتی ہے۔ یہ مسائل کبھی عالم فطرت کی طرف سے پیش آتے ہیں اور کبھی دوسرے انسانوں کی طرف سے۔ دونوں حالتوں میں مسئلہ کا حل یہ ہے کہ ضبط و تحمل کے ساتھ اس کا سامنا کیا جائے۔ مسئلہ کو غم کا سوال بنانے کے بجائے اس کو تدبیر کا سوال بنایا جائے۔ مسئلہ پیش آجانے کے بعد اگر آپ صبر و تحمل کا ثبوت دیں تو آپ کی دلجمعی اور آپ کا ذہنی سکون باقی رہے گا۔ آپ اس پوزیشن میں ہوں گے کہ آپ اپنی پوری صلاحیت کو پیش آمدہ مسئلہ کے حل کے لئے استعمال کر سکیں۔ اور اگر ایسا ہو کہ آپ مسئلہ پیش آنے کے بعد غم میں مبتلا ہو کر اس کو اپنے لئے دردسر بنالیں تو مسئلہ کے مقابلہ میں آپ اپنا ضروری حصہ ادا کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔ یہ ایسا ہی ہو گا جیسے اپنے حریف کو خود سے بلا مقابلہ جیت (unopposed victory) کا موقع دے دیا جائے۔

خطرہ کہاں ہے

ایک عربی پرچہ میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔اس کا عنوان تھا: **الاقليات المسلمة تواجه خطر الذوبان** ۔یعنی مسلم اقلیتوں کواس خطرہ کاسامنا ہے کہ وہ اکثریتی فرقہ میں گھل مل جائیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ :**الاسلام یعلو ولایعلی** (اسلام ہمیشہ غالب رہتا ہے وہ کبھی مغلوب نہیں ہوتا) فتح الباری ۲۶۱/۳۔یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام کواللہ تعالیٰ نے غلبہ کی حیثیت عطا فرمائی ہے تو اس کے لیے مغلوب ہونے یا جذب ہو جانے کا خطرہ کیوں محسوس کیا جارہا ہے۔

اس کی وجہ بالکل سادہ ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں میں فرق نہ کرنا ہے۔کوئی مسلم گروہ اپنے زوال کی بنا پر مذکورہ قسم کے خطرہ میں مبتلا ہو سکتا ہے لیکن اسلام،ایک ربانی نظریہ کی حیثیت سے اس سے ارفع واعلیٰ ہے کہ اس کو کسی بھی حال میں غیر اسلامی طاقتوں سے مغلوب ہونے یا ان میں جذب ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں کے لئے یہ خطرہ پیدا ہو کہ وہ کسی غیر مسلم طاقت سے مغلوب ہو جائیں گے یا اس میں جذب ہو جائیں گے تو پیشگی طور پر سمجھنا چاہئے کہ اس کی وجہ خود مسلمانوں کا اسلام میں کمزور ہونا ہے نہ کہ غیر مسلموں کا ان کے مقابلہ میں طاقتور ہو جانا۔

اس لیے جب بھی اس قسم کا خطرہ پیدا ہو تو مصلحین کو چاہئے کہ وہ خود مسلم نسلوں کو دوبارہ اسلام پر اٹھانے کی کوشش کریں۔وہ ان کے کیس کو قومی کیس کے بجائے اسلام کا کیس بنا دیں۔اس کے بجائے غیر مسلم طاقتوں کے خلاف قولی یا عملی ہنگامہ آرائی کرنا ایک غیر متعلق فعل ہے جس کا خدا کی اس دنیا میں کوئی فائدہ نکلنے والا نہیں۔مسلمانوں کا ہر مسئلہ داخلی کمزوری کا مسئلہ ہے۔مسلمانوں کے ہر مسئلہ کو صرف داخلی استحکام کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے۔

ترقی کے مواقع

۱۹۹۹ کے سروے کے مطابق، ہندستان میں اس سال کا سب سے زیادہ امیر بنگلور کا ایک مسلمان تھا جس کا نام عظیم ہاشم پریم جی ہے۔ اس سال اس کا سرمایہ ۱۷۶ بلین روپئے تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ترقی کے مواقع لامحدود ہیں۔ حتی کہ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ اقلیتی فرقہ کا ایک فرد ترقی کر کے اکثریتی فرقہ سے آگے بڑھ جائے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۲۷ جون ۱۹۹۹)

ممتاز تعلیمی ادارہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (بمبئی) کے ۳۷ ویں جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر اپنے کانوکیشن ایڈریس میں جناب عظیم ہاشم نے اپنے تجربات بتائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عظیم ہاشم کی ترقی ۲۵ سال کی لگاتار محنت کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے لمبی مدت تک یہ کیا کہ ایک طرف خود اپنی صلاحیتوں کو آخری حد تک اپنے کاروبار میں لگا دیا۔ دوسری طرف انھوں نے بار بار سفر کر کے ملک بھر سے اعلیٰ قابلیت کے نوجوان حاصل کئے اور ان کے ذریعہ ایک بہترین ٹیم تیار کی۔ انھوں نے اپنے اور دوسروں کے تجربات سے سبق سیکھا۔ ان کا کہنا ہے کہ کامیابی کا سب سے بڑا راز کبھی ختم نہ ہونے والی سخت محنت ہے۔ اس طرح طویل منصوبہ بند عمل کے ذریعہ انھوں نے اپنی موجودہ کامیابی حاصل کی۔ عظیم ہاشم نے کہا کہ: ''مستقبل وہ نہیں ہے جو آپ کے ساتھ پیش آتا ہے بلکہ مستقبل وہ ہے جسے آپ خود بناتے ہیں۔''

اس دنیا میں ہر آدمی وہی ترقی حاصل کر سکتا ہے جو ترقی کسی دوسرے نے حاصل کی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اپنی مطلوب کامیابی کے لئے اس کے مطابق ضروری عمل کیا جائے۔

وہ عمل کیا ہے۔ وہ عمل ہے—مقصد کا واضح تصور، اس کو پانے کا عزم مصمم، اپنی پوری صلاحیت کو اس میں لگا دینا، لائق افراد کے ذریعہ متحدہ کوشش کرنا، ہر چیلنج سے نیا حوصلہ لینا، اپنی معلومات میں برابر اضافہ کرتے رہنا، یہی اس دنیا میں کامیابی کے اصول ہیں۔ اور جو آدمی ان اصولوں کو بھرپور طور پر اپنا لے اس کے لئے ترقی اتنا ہی زیادہ یقینی بن جاتی ہے جتنا کہ شام کے بعد اگلی صبح کا طلوع ہونا۔

کامیاب فارمولا

بنگلور کے ڈاکٹر احمد سلطان انوکھی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ٹیپو سلطان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ان کا مزاج برعکس طور پر یہ تھا کہ محبت سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۹۹ کو تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

وہ جب بھی دہلی آتے تو مجھ سے ملتے اور اپنے "کامیاب فارمولا" کی سبق آموز مثالیں بیان کرتے۔ ایک بار ان کے صاحبزادے رات کے وقت گاڑی لے کر باہر نکلے۔ وہ گیارہ بجے واپس آئے تو وہ گاڑی باہر کھڑی کر کے گھر میں داخل ہوئے اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک کی آواز آئی۔ ڈاکٹر احمد سلطان صاحب نے دروازہ کھولا تو دو ہندو نوجوان باہر کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے غصہ کے لہجہ میں بتایا کہ آپ کے صاحبزادہ نے ہمارے اسکوٹر کو ٹکر ماری اور پھر بھاگ آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کوئی جواب دینے کے بجائے نرمی سے کہا کہ اندر تشریف لایئے، بیٹھ کر بات ہو گی۔ دونوں اندر آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کو ایک میز کے کنارے کرسی پر بٹھایا اور کہا کہ اس وقت سردی کا موسم ہے۔ آیئے ہم لوگ پہلے چائے پئیں پھر بات کریں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کا غصہ ختم ہو چکا تھا، دونوں خوش خوش واپس چلے گئے۔

ایک بار ایک ہندو نوجوان ان کے پاس آیا۔ اس نے رو کر کہا کہ میں ایک بڑے مسئلہ سے دوچار ہوں۔ آپ میرا مسئلہ حل کیجئے۔ اس نے بتایا کہ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ اس کے بعد میرے باپ نے مجھ کو گھر سے نکال دیا۔ چھ مہینے ہو چکے ہیں اور ابھی تک وہ راضی نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ تم انھیں سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔ تم خاموشی سے جاؤ اور اپنے باپ کے قدموں پر سر رکھ کر کہو کہ اے باپ، میری غلطی کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ نوجوان نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ اپنے گھر گیا تو اس کے باپ نے اس کو ڈانٹا۔ بیٹا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے باپ کے

قدموں پر گر پڑا۔ اس کے بعد باپ کا جذبۂ پدری ابھر آیا۔ اس نے بیٹے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ چند منٹوں کے اندر ساری بات ختم ہو گئی۔

ایک بار ڈاکٹر صاحب ایک شہر میں گئے۔ وہاں کے مسلمانوں نے بتایا کہ جلد ہی یہاں کٹر ہندوؤں کا ایک جلوس نکلنے والا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ لوگ زبردست تیاری کر رہے ہیں۔ وہ اپنا جلوس مسلم محلہ سے لے جائیں گے اور کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر فساد کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ لوگ میرا ایک مشورہ مان لیجئے اور پھر یہاں کوئی فساد نہیں ہوگا۔ آپ لوگ ایسا کیجئے کہ جس دن جلوس نکلنے والا ہو، بازار سے دو درجن پھولوں کے ہار لے آیئے۔ جب ان کا جلوس آپ کی مسجد کے سامنے پہنچے تو آپ لوگ پھولوں کا ہار لے کر باہر آئیں اور جو ہندو جلوس کے آگے آگے چل رہے ہیں ان سے کہیں کہ ہم آپ کا سواگت کرتے ہیں اور پھر ان کے گلے میں ایک ایک ہار ڈال دیں۔ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جس دن وہاں ہندو مسلم ٹکراؤ ہونے والا تھا، وہ ان کے لئے ہندو مسلم ملاپ کا دن بن گیا۔

ایک بار بنگلور میں وہ اپنے گھر کے قریب سڑک پر چل رہے تھے۔ پیچھے سے شہر کے ایک ہندو کی گاڑی آئی جو مسلمانوں کا مخالف سمجھا جاتا تھا۔ اس کی گاڑی ڈاکٹر صاحب سے ٹکرا گئی اور ڈاکٹر صاحب سڑک پر گر پڑے۔ ان کو کئی جگہ زخم آئے۔ مذکورہ ہندو اپنی گاڑی روک کر ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ آپ میری گاڑی پر بیٹھ جائیں میں آپ کو لے کر اسپتال چلتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ مسلم علاقہ ہے۔ مسلمانوں نے اگر تم کو دیکھ لیا تو وہ تم کو مارے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے سخت اصرار کر کے اس کو وہاں سے بھیج دیا۔ اس کے بعد مذکورہ ہندو ہمیشہ کے لئے ڈاکٹر صاحب کا دوست بن گیا۔

ڈاکٹر سلطان کے دل میں کسی کے لئے نفرت نہ تھی۔ وہ ہر ایک کو پیار و محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذکورہ کامیاب فارمولہ اپنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دنیا میں محبت سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ مگر نادان لوگ نفرت کو سب سے بڑا ہتھیار سمجھ لیتے ہیں۔

صدی کی شخصیت

عالم اسلام کی معروف شخصیت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ کو انتقال ہو گیا۔ مولانا موصوف ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی شخصیت گویا سو سالہ دور کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ تاریخ میں وہ اس دور کی علامت کے طور پر دیکھے جائیں گے۔ ان کو بلاشبہہ صدی کی شخصیت (Man of the Century) کہا جا سکتا ہے۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی بیک وقت مختلف اور متنوع خصوصیات کے مالک تھے۔ وہ ایک ممتاز عالم تھے۔ دار العلوم ندوۃ (لکھنؤ) کو ان کے زمانہ میں غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ انھوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور اسی طرح دوسرے بہت سے اداروں کی کامیاب قیادت کی۔ بیسویں صدی میں اٹھنے والی تقریباً تمام بڑی بڑی اسلامی تحریکوں سے ان کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق تھا۔ وہ ہر حلقہ اور ہر گروہ میں یکساں طور پر عزت واعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کو بلا اختلاف ایک بین اقوامی شخصیت کہا جا سکتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک فرد اپنی قوم میں نمائندۂ قوم کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ مولانا موصوف کو یہی حیثیت حاصل تھی۔ ایسا شخص کسی قوم کے لئے بے حد قیمتی ہے۔ اپنی اس حیثیت کی بنا پر وہ پوری قوم کے لئے شیرازۂ اتحاد بن جاتا ہے۔ وہ اپنی قوم اور دوسری قوموں کے درمیان عملاً رابطہ کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ وہ تمام لوگوں کے لئے مرجعِ قوم بن جاتا ہے۔ یعنی ایک ایسا شخص جس سے پوری قوم کے معاملہ میں رجوع کیا جا سکے۔ وغیرہ۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی ذات میں یہ تمام حیثیتیں بہ تمام وکمال جمع ہو گئی تھیں۔ مولانا محمد منظور نعمانی نے ایک بار مولانا موصوف کو "رجل موھوب" کہا تھا۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے لئے یہ خطاب لفظ بلفظ درست ہے۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا کارنامۂ حیات تقریباً پوری صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک متحرک صدی تھے۔ صدی کی

آخری تاریخ کو یہ متحرک شخصیت خاموش ہو گئی۔ وہ انسانوں سے جدا ہو کر اپنے رب سے جا ملی۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے اندر بیک وقت مختلف اور متنوع خصوصیات موجود تھیں۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے کہا تھا کہ یورپ میں جو کام اکادمی کرتی ہے، وہ ہمارے یہاں "اک آدمی" کرتا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس قول کا ایک زندہ نمونہ تھے۔ وہ ایک فرد تھے مگر انھوں نے کئی اداروں کے برابر کام کیا۔

مولانا موصوف نے ایک طرف دار العلوم ندوہ جیسے ادارہ کے ذریعہ مسلمانوں کو علم دین سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف مؤسسہ مطالعات و تحقیقات اسلامی لگو مبرگ جیسے اداروں کے ذریعہ لوگوں کے لئے عصری معرفت کا سامان کیا۔ ایک طرف انھوں نے اپنی موثر تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں عملی جوش کو ابھارا اور دوسری طرف انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ انھیں گہرے علمی شعور سے آشنا کیا۔

ایک طرف انھوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذریعہ مسلمانوں کے ملی تحفظ کا انتظام کیا تو دوسری طرف "پیام انسانیت" کی تحریک کے ذریعہ انھیں داعی کے مقام پر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ ایک طرف انھوں نے ردّة ولا ابابکر لها جیسی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں میں دفاع اسلام کا جذبہ ابھارا اور دوسری طرف ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین جیسی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنی تعمیر نو کی طرف متوجہ کیا۔ ایک طرف انھوں نے رابطہ العالم الاسلامی کے اہم رکن کی حیثیت سے عالمی مسلم اتحاد کی کوشش کی اور دوسری طرف رابطۂ ادب اسلامی کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے اندر علم و ادب کے حصول کا شوق ابھارا۔ ایک طرف انھوں نے مدارس دینیہ کے قیام کے ذریعہ قدیم علوم کو زندہ کیا اور دوسری طرف آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سنٹر کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے اندر جدید علوم کے ماہر پیدا کرنے کی کوشش کی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات بہت سی اعلیٰ قدروں کا نمونہ بن گئی تھی۔ انھیں میں سے ایک چیز وہ ہے جس کی بابت کہا گیا ہے کہ ـــــ دنیا سے بے نیاز ہو جاؤ، دنیا خود تمہاری طرف دوڑ کر آئے گی۔ مولانا موصوف دنیا کی چیزوں سے بے نیاز ہو گئے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا نے خود اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیا۔

ایک بار ایک عرب سلطان ندوۃ (لکھنؤ) آئے۔ ان کے استقبالیہ میں جو جلسہ ہوا اس میں تقریر کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایک عرب بزرگ کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا تھا: نعم الامیر علی باب الفقیر و بئس الفقیر علی باب الامیر۔ مولانا موصوف ساری زندگی اہل دنیا سے بے نیاز رہے۔ مگر اہل دنیا نے خود اپنی ساری متاع ان کے سامنے پیش کر دی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔ ان کو بڑے بڑے ایوارڈ دئے گئے، مثلاً کنگ فیصل ایوارڈ اور اسی طرح برونائی اور عرب امارات کے خصوصی ایوارڈ وغیرہ۔

مولانا موصوف کی ذات اس حقیقت کی ایک عملی مثال تھی کہ مال، عہدہ، عزت، سب انسان کے تابع ہیں نہ کہ انسان ان چیزوں کے تابع ہے۔ انسان اگر اپنی انسانیت کو بلند کر لے تو بقیہ تمام چیزیں اپنے آپ اس کو حاصل ہو جائیں گی، بغیر اس کے کہ اس نے ان چیزوں کے لئے براہ راست جدو جہد کی ہو۔

ایک شاعر نے کسی کے بارے میں کہا تھا: وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ وہ اپنی ذات میں ایک عالم تھے۔ ان کی موت بلاشبہہ موت العالِم موت العالَم کی مصداق ہے۔ تاہم قابل اطمینان بات یہ ہے کہ مولانا موصوف نے اپنے پیچھے اپنے شاگردوں کی عظیم تعداد چھوڑی ہے۔ یقین ہے کہ مولانا موصوف کے بعد ان کی تربیت سے فیض یافتہ یہ حضرات اس عربی شعر کا مصداق ثابت ہوں گے: إذا مات منا سید قام سید (جب ہمارا ایک سردار وفات پاتا ہے تو دوسرا سردار کھڑا ہو جاتا ہے)۔

ملک کی تعمیر اور مسلمان

قومی تعمیر کا عمل ایک مسابقت کا عمل ہے۔ یہ ایک مسابقتی دوڑ ہے۔ معاملہ کے اس پہلو نے قومی تعمیر کے عمل کو ایک بے حد نازک عمل بنادیا ہے۔ قومی تعمیر کے عمل میں اگر آپ ایک دن کی بھی غفلت کریں تو اس کا خمیازہ آپ کو ایک صدی تک بھگتنا پڑے گا۔

اس کی ایک مثال دستور ہند کا مسئلہ ہے۔ آزادی (۱۹۴۷) کے بعد ملک کے اعلیٰ ترین دماغوں نے ملک کا بظاہر ایک نہایت جامع دستور بنایا۔ مگر اس میں ایک بے حد اہم پہلو جگہ پانے سے رہ گیا۔ اس میں بنیادی حقوق(fundamental rights) کی دفعات تو رکھی گئیں لیکن بنیادی فرائض(fundamental duties) کا اس میں سرے سے کوئی باب ہی نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کے بعد پوری قوم نے اپنے حقوق کو تو ضرورت سے زیادہ جانا مگر اپنی ذمہ داریوں کی بقدر ضرورت بھی اسے خبر نہ ہو سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری قوم حقوق شناس (right conscious) بن کر رہ گئی۔ وہ فریضہ شناس(duty concsious) نہ بن سکی۔

سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی نے بعد کو اس کی تلافی کرنا چاہا اور ایک ترمیم کے ذریعہ دستور میں بنیادی ذمہ داریوں کا ایک مختصر باب شامل کیا۔ مگر اب اتنی زیادہ دیر ہو چکی تھی کہ اس ترمیم کے باوجود قومی کردار میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ اس غلطی کے تباہ کن نتائج آج اتنے زیادہ عام ہو چکے ہیں کہ یہاں اس کی مثال دینے کی ضرورت نہیں۔

یہی معاملہ ہندو ۔ مسلم تعلقات کا ہے۔ ۱۹۴۷ میں جب ہندستان آزاد ہوا تو اس کے بعد ملک میں دو بڑے فرقے موجود تھے ۔ ایک ہندو، دوسرے مسلمان۔ عددی اعتبار سے ہندو اکثریت میں تھے اور مسلمان عددی اعتبار سے اقلیت میں تھے۔ یہ تناسب بے حد اہم تھا مگر یہاں بھی بروقت صحیح رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے دونوں ہی فرقوں کا ذہن غلط رخ پر چل پڑا۔

ایک طرف ہندوؤں کا ذہن یہ بنا کہ مسلمان اس ملک میں بوجھ(liability) کی حیثیت

رکھتے ہیں۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کا ذہن یہ بنا کہ ہندوان کے لئے ایک غیر ہمدرد اکثریت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح دونوں ہی فرقے ایک دوسرے کے بارے میں غیر حقیقت پسندانہ سوچ کا شکار ہو گئے اور وہ مثبت تاریخی واقعہ انجام نہ پاسکا جو حالات نے دونوں کے لئے مقدر کیا تھا۔

وہ واقعہ یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کو تاریخ کے فیصلہ کے طور پر قبول کریں اور فطرت کے اصول پر دونوں کے درمیان صحت مند مقابلہ جاری ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ہندستان بلاشبہہ ایک اعلیٰ ترقی یافتہ ملک بن چکا ہوتا، جیسا کہ بہت سے دوسرے ملک اسی حقیقت شناسی کی بنا پر ترقی یافتہ ملک بنے ہوئے ہیں۔

انڈونیشیا کے موجودہ صدر پروفیسر عبدالرحمٰن وحید سے چند سال پہلے میری ملاقات روم (اٹلی) میں ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ انڈونیشیا اور ملیشیا دونوں مسلم ملک سمجھے جاتے ہیں۔ مگر ملیشیا میں زبردست ترقی ہوئی ہے جب کہ انڈونیشیا میں کوئی قابل ذکر ترقی نہ ہو سکی۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔

پروفیسر عبدالرحمٰن وحید نے جواب دیا کہ اس کا سبب بالکل ظاہر ہے۔ اصل یہ ہے کہ ملیشیا میں مسلمانوں کو ایک طاقتور اقلیت کا سامنا ہے۔ اس بنا پر وہاں مسلسل طور پر مسابقت (competition) کا ماحول قائم رہتا ہے۔ مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہر لمحہ چوکنا رہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر غفلت کی تو دوسرا گروہ آگے بڑھ جائے گا، اور وہ اس کے مقابلہ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ مسابقت کے اس ماحول نے وہاں دونوں گروہوں کو ملک کا مفید حصہ بنادیا ہے۔ مسابقت کے اس ماحول کی بنا پر دونوں ترقی کر رہے ہیں اور نتیجۃً پورا ملک ترقی کے راستہ پر گامزن ہے۔

مگر انڈونیشیا کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کیوں کہ انڈونیشیا میں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں۔ اس بنا پر ان کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں۔ اس صورت حال نے انڈونیشیا کے مسلمانوں کو ایک بے

اندیشہ قوم بنادیا ہے۔ چنانچہ وہ سو رہے ہیں۔ وہ ملک میں کسی بڑے ترقیاتی عمل کا آغاز نہ کر سکے۔

ہندستان کا معاملہ بھی تقریباً یہی ہے۔ ہندستان میں ایک طرف اگر ہندو اکثریت ہے تو دوسری طرف مسلم اقلیت، جو تعداد میں اتنی زیادہ ہے کہ انڈونیشیا کے بعد وہ دنیا کی سب سے بڑی مسلم ملت بن گئی ہے۔

اس صورت حال کا فطری نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہندستان میں دونوں کے درمیان اسی قسم کا صحت مند مقابلہ جاری ہو جس کی ایک مثال ملیشیا میں دکھائی دیتی ہے۔ مگر بد قسمتی سے دونوں ہی گروہ ایک دوسرے کے بارہ میں غیر حقیقت پسندانہ سوچ کا شکار ہوگئے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو غیر مطلوب اقلیت سمجھا اور مسلمانوں نے ہندوؤں کو غیر ہمدرد اکثریت۔ اس کے نتیجہ میں دونوں کے درمیان بے بنیاد غلط فہمیوں کا جنگل اگ آیا۔ وہ تاریخ کے پیدا کردہ فطری ماحول میں جینے کے بجائے خود ساختہ مصنوعی ماحول میں جینے لگے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان اور انڈیا دونوں نے تقریباً ایک ساتھ اپنے نئے قومی سفر کا آغاز کیا مگر واقعات بتاتے ہیں کہ جاپان صرف ۲۵ سال کی مدت میں دنیا کی ایک مضبوط اقتصادی طاقت بن گیا۔ جب کہ ہندستان پچاس سال کی مدت گزارنے کے بعد بھی کوئی قابل ذکر ترقی حاصل نہ کر سکا۔

اب ہندستان نئی صدی کے دور میں قدم رکھ رہا ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنے حالات کا ازسر نو جائزہ لیں۔ دونوں ماضی کی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اکیسویں صدی میں اس کو جاری نہ رکھنے کا فیصلہ کریں۔ اور پھر ہم دیکھیں گے کہ دس سال سے زیادہ مدت نہیں گزرے گی کہ ملک ایک نئے دور ترقی میں اپنا تیز رفتار سفر شروع کر چکا ہوگا۔

کسی مفکر کا قول ہے کہ ہر ناکامی کا آغاز دماغ سے ہوتا ہے اور ہر کامیابی کا آغاز بھی دماغ سے۔ اب دونوں فریقوں کو جو کرنا ہے وہ صرف یہ کہ وہ اپنے مذکورہ نقطۂ نظر کو بدل ڈالیں۔ دونوں فرقے ایک دوسرے کو اس نظر سے دیکھنا چھوڑ دیں جس نظر سے وہ پچھلے پچاس سال کے دوران

ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ہیں۔اس کے برعکس دونوں ایک دوسرے کو قومی زندگی کے صحت مند حصہ دار کے روپ میں دیکھیں۔دونوں ایک دوسرے کے چیلنج کو صحت مند مقابلہ میں بدل دیں۔دونوں ایک وجود کے دائیں اور بائیں بازو بن جائیں۔دونوں قومی تعمیر کے عمل میں ایک دوسرے کے ساتھ صحت مند مقابلہ کریں نہ کہ فرقہ وارانہ نفرت کے میدان میں۔دونوں ملک کے اقتصادی عمل کی مشین میں دندانہ دار پہیہ (cog wheel) کی مانند بن جائیں۔اور پھر دونوں خود بھی ترقی کریں گے اور ملک کو بھی اعلیٰ ترقی کے دور میں پہنچانے کا سبب بن جائیں گے۔

چیلنج زندگی کی ایک لازمی حقیقت ہے۔یہ فطرت کا نظام ہے اور کوئی بھی سماج فطرت کے اس نظام سے خالی نہیں ہو سکتا۔اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے دو طریقے ہیں۔ایک، مریضانہ مقابلہ۔ اور دوسرا، صحت مند مقابلہ۔مریضانہ مقابلہ کا نتیجہ موت ہے اور صحت مند مقابلہ کا نتیجہ زندگی۔

مریضانہ مقابلہ یہ ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو دشمن کی نظر سے دیکھیں۔وہ ایک دوسرے سے نفرت کریں۔وہ ایک دوسرے کو مٹا کر اپنا مستقبل بنانا چاہیں۔اس قسم کا طریقہ گویا فطرت کی تردید ہے۔وہ تاریخ کے فیصلہ کو قبول نہ کرنا ہے۔اور جو لوگ ایسا کریں ان کے لئے خدا کی اس دنیا میں تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

چیلنج کا صحت مند مقابلہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا شریک سفر سمجھیں۔دونوں ایسے دو بھائی بن جائیں جو دوڑ کے مقابلہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہوں، اس کے باوجود دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے نفرت نہ پیدا ہو۔دونوں مقابلہ کی حالت کو ایک دوسرے کے لئے مہمیز سمجھیں نہ کہ مخالفت اور عداوت۔

ہندستان میں اعلیٰ ترقی کے لئے اسی قسم کے صحت مند مقابلہ کی ضرورت ہے۔امریکہ نے اپنے یہاں اسی طرح صحت مند مقابلہ کا ماحول قائم کر کے اعلیٰ کامیابی حاصل کی ہے۔ہمیں بھی ہندستان میں اسی ماحول کو زندہ کرنا ہے۔اسی میں ہر فرقہ کی ترقی ہے اور اسی میں خود ملک کی ترقی بھی۔

اسلام کے نام پر غیر اسلام

ایک تعلیم یافتہ مسلمان جو امریکہ میں رہتے ہیں انھوں نے ایک ملاقات کے دوران کہاکہ آج کل امریکہ میں اسلام کی تصویر اتنی خراب ہو گئی ہے کہ میں اپنے کو مسلمان بتاتے ہوئے گھبراتا ہوں۔ کوئی مجھ سے میرا مذہب پوچھتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ میں مذہب انسانیت کو مانتا ہوں۔ اگر میں اپنا مذہب اسلام بتاؤں تو وہ فوراً کہے گا: "پھر تو تم ایک دہشت گرد ہو":

Then you must be a terrorist

انھوں نے کہاکہ اسلام کی یہ تصویر جدید میڈیا نے بنائی ہے۔ میں نے کہاکہ نہیں۔ بلکہ اسلام کی یہ تصویر خود مسلمانوں نے بنائی ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان جگہ جگہ اسلام کے نام پر تشدد کی تحریکیں چلارہے ہیں۔ اسی کو میڈیا کے لوگ رپورٹ کرتے ہیں۔ مسلمان اپنی یہ تحریکیں چونکہ اسلام کے نام پر چلاتے ہیں اس لئے وہ اسلام سے منسوب ہو کر میڈیا میں آتی ہیں۔ جب مسلمان خود اس قسم کی تحریکوں کو اسلام کے نام پر چلارہے ہوں تو میڈیا ان کو کسی اور نام سے کیسے رپورٹ کرے گا۔

انھوں نے کہاکہ اس قسم کی متشددانہ تحریکیں صرف کچھ مسلمان چلاتے ہیں نہ کہ سارے مسلمان۔ پھر ان کی بنیاد پر سارے مسلمانوں کے بارے میں منفی رائے قائم کرنا کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔ میں نے کہاکہ یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی تحریکیں تھوڑے مسلمان چلاتے ہیں مگر اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ بقیہ مسلمان ان تحریکوں کی کھلی مذمت نہیں کرتے۔ وہ ان کے بارے میں خاموشی کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے خود اسلامی اصول کے مطابق، یہ کہنا درست ہو گا کہ اسلام کے نام پر نفرت اور تشدد کی ان تحریکوں کو چلانے کے لئے اگر تھوڑے لوگ براہ راست ذمہ دار ہیں تو بقیہ لوگ اس کے بالواسطہ ذمہ دار۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہ روش بے حد افسوسناک ہے۔ اسلامی حکومت اور نظام

مصطفیٰ اور اسلامی جہاد کے نام پر ایسے افعال کئے جارہے ہیں جو سراسر اسلام کے خلاف ہیں۔ جو لوگوں کو خدا کے دین سے قریب کرنے کے بجائے انھیں اس سے دور کر رہے ہیں۔ اسی اندوہناک صورت حال کو دیکھ کر ایک شاعر نے بجا طور پر کہا ہے کہ:

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغ مصطفوی — جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

اسلامی نظام

موجودہ زمانہ میں اس قسم کی متشددانہ تحریکیں نظام اسلام یا نظام مصطفیٰ کے نام پر چلائی جارہی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریکیں اسلام کے نام پر سیاسی لیڈری کرنے کے ہم معنی ہیں۔ سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے تحریکیں چلانا اسلام میں جائز ہی نہیں۔ اسلامی تحریک کا نشانہ فرد کو اسلامائز کرنا ہے نہ کہ حکومت یا اسٹیٹ کو اسلامائز کرنا۔ صوفیاء کرام نے سیکڑوں سال تک جو کام کیا وہ فرد کو اسلامائز کرنے کا کام تھا۔ یہ کام پرامن طور پر مسلسل جاری رہا، وہ کبھی نفرت اور تشدد پھیلانے کا ذریعہ نہ بن سکا۔ صوفیاء کے ذریعہ ہمیشہ امن اور انسانیت کو فروغ حاصل ہوا جب کہ موجودہ نام نہاد انقلابی تحریکیں برعکس نتیجہ ظاہر کررہی ہیں۔

اسلام کے ساتھ نفرت اور تشدد کا وابستہ ہونا صرف موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم لیڈروں کا پیدا کردہ ہے جنھوں نے خود ساختہ طور پر حکومت واقتدار کو نشانہ بنا کر اپنی تحریکیں چلائیں۔ ان لوگوں نے اپنے عمل سے اسلام کو نفرت اور تشدد کا دین بنادیا ہے حالانکہ خدا کا بھیجا ہوا اسلام امن اور خیر خواہی کا مذہب ہے۔ مسلمان خیر خواہِ انسانیت ہوتا ہے نہ کہ فوجدارِ انسانیت۔

اسلامی جہاد

اگر ایک شخص میدان میں کھڑا ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے یا اٹھ بیٹھ کرے اور کہے کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں تو اس کے کہنے سے اس کا یہ فعل نماز نہیں بن جائے گا۔ نماز کی کچھ متعین شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کے ساتھ جو عمل کیا جائے وہ نماز ہے، ورنہ وہ نماز نہیں۔

یہی معاملہ اسلامی جہاد کا ہے۔ جہاد کی کچھ متعین شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کی پابندی کے ساتھ جو عمل کیا جائے وہ اللہ کے نزدیک جہاد ہوگا۔ اور جس عمل میں یہ شرطیں نہ پائی جائیں وہ بے معنی ہنگامہ آرائی ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں جہاد۔

اسلامی جہاد وہ ہے جو اللہ کے راستہ میں کیا جائے۔ ملک یا مال جیسی دنیوی چیزوں کے لئے لڑائی چھیڑنا اور اس کو جہاد بتانا صرف فساد ہے۔ ایسے لوگوں کو کسی بھی حال میں اسلامی جہاد کا کریڈٹ نہیں دیا جاسکتا۔ اسی طرح اسلامی شریعت کے مطابق کسی کے خلاف جنگ کا اعلان باقاعدہ طور پر قائم شدہ حکومت ہی کر سکتی ہے۔ افراد کو یہ اجازت نہیں کہ وہ بطور خود جہاد کے نام پر کسی کے خلاف لڑائی چھیڑ دیں۔ افراد کو خواہ کوئی بھی شکایت ہو مگر انھیں لازماً پرامن دائرہ میں کام کرنا ہے۔ جنگ اور تشدد کا طریقہ اختیار کرنا ان کے لئے کسی بھی حال میں جائز نہیں۔

اسی طرح جہاد (بمعنی قتال) مکمل طور پر ایک دفاعی عمل ہے۔ جارحانہ قتال اسلام میں قطعاً جائز نہیں۔ مزید یہ کہ اگر کوئی قوم جارحانہ حملہ کرے تب بھی پہلے جنگ کو ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ جنگ صرف اس وقت کی جائے گی جب کہ اس کو ٹالنے یا اعراض کرنے کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی ہوں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے ان کو ۸۰ سے زیادہ بار جنگ اور ٹکراؤ میں الجھانا چاہا مگر ہر بار آپ نے حسن تدبیر سے جنگ کو ٹال دیا۔ صرف تین بار (بدر، احد، حنین) کے مواقع پر آپ عملی طور پر جنگ میں شریک ہوئے جبکہ جنگ کے بغیر کوئی چارہ ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔

اسی طرح خود حکومت کے لئے بھی جنگ کرنا صرف اس وقت جائز ہوگا جب کہ اس نے جنگ کی ضروری تیاری کرلی ہو۔ ضروری تیاری کے بغیر جنگ میں کودنا خودکشی ہے نہ کہ اسلامی معنوں میں کوئی جہاد۔ اسلام میں صرف نتیجہ خیز اقدام کی اجازت ہے۔ جس اقدام کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے خودکشی کی ایک چھلانگ ہے نہ کہ کوئی اسلامی یا دینی عمل۔

اسلام میں جائز جنگ بھی ایک کھلے عمل کا نام ہے، خفیہ انداز کی جنگی کارروائی کرنا اسلام

میں ہر گز جائز نہیں۔ اس اصول کی بنا پر پراکسی وار (proxy war) اسلام میں ناجائز قرار پاتی ہے۔ کیوں کہ پراکسی وار میں ملوث حکومت خفیہ مدد کے ذریعہ کسی اور گروہ سے تشدد کی کارروائی کراتی ہے، وہ اعلان کے ساتھ اس میں شریک نہیں ہوتی۔

یرغمال بنانا

موجودہ زمانہ کے کچھ مسلمان اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف وہ متشددانہ کارروائیاں کر رہے ہیں جن کو ہائی جیکنگ یا یرغمال بنانا کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے تمام طریقے اسلام میں سراسر ناجائز ہیں۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ یقینی طور پر اللہ کی پکڑ سے بے خوف ہیں، ورنہ وہ ہرگز ایسی مذموم حرکتیں نہ کریں۔ ہوائی جہاز کو ہائی جیک کرنا بے قصور انسانوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنانا ہے۔ اس قسم کی بزدلانہ حرکت انسانیت کے خلاف بھی ہے اور خدا کے دین کے خلاف بھی۔

یرغمال بنانے کا غیر اسلامی ہونا دور اول کے ایک واقعہ سے ثابت ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین جو مکہ میں تھے، انھوں نے یہ خلاف انسانیت حرکت کی تھی کہ کچھ مسلمانوں کو اپنے یہاں قید کر رکھا تھا۔ اس دوران پیغمبر اسلام اور آپ کے مخالفین کے درمیان وہ معاہدہ ہوا جو معاہدہ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ کے وقت پیغمبر اسلام نے مخالفین سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ تم لوگ ہمارے آدمیوں کو واپس کرو۔ البتہ خود یک طرفہ طور پر یہ اعلان فرمایا کہ اگر تمہارا کوئی آدمی ہمارے قبضہ میں آجائے گا تو ہم اس کو اپنے پاس نہیں روکیں گے بلکہ اس کو تمہاری طرف واپس کر دیں گے۔ اس سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ فریق ثانی اگر ہمارے آدمیوں کو یرغمال بنائے تب بھی ہمارے لئے جائز نہیں کہ ہم ان کے آدمیوں کو یرغمال بنانے لگیں۔

اصل ذمہ دار

موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر نفرت اور تشدد کا جو طوفان برپا ہے اس کا اصل ذمہ دار کون ہے۔ اس کا اصل ذمہ دار وہ مسلم نوجوان نہیں ہیں جو نفرت اور تشدد کے مذکورہ کام میں مبتلا

ہیں۔ بلکہ اس کے اصل ذمہ دار وہ نام نہاد اسلامی مفکرین ہیں جنھوں نے ان نوجوانوں کو اسلامی انقلاب کے نام پر ایک ایسا فکر دیا جو عملی طور پر یہی منفی نتیجہ پیدا کر سکتا تھا اور یہی اس نے پیدا کیا۔

اسلام کا طریقہ دعوت کا طریقہ ہے، اس کے برعکس دوسرا طریقہ سیاست کا طریقہ ہے۔ دعوت کا طریقہ امن کی بنیاد پر چلتا ہے اور سیاست کا طریقہ ٹکراؤ کی بنیاد پر چلایا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے نام نہاد مفکرین نے اسلام کی سیاسی تعبیر کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تحریک سیاست کی تحریک بن گئی۔ اور پھر غلط طور پر اسلام کے ساتھ وہ تمام نا محمود چیزیں جڑ گئیں جو صرف سیاست اور سیاسی تحریک کا حصہ ہیں۔

دعوت اپنے فطری مزاج کی بنا پر فریق ثانی کو اپنے امکانی دوست کے روپ میں دیکھتی ہے۔ سیاست کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اہل سیاست اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر فریق ثانی کو اپنے حریف اور دشمن کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دعوتی عمل سے رحمت کلچر وجود میں آتا ہے اور سیاسی عمل سے صرف نفرت کلچر۔ جس سماج میں رحمت کلچر ہو وہاں ہر قسم کی اچھائیاں فروغ پائیں گی۔ اور جہاں نفرت کلچر ظہور میں آئے وہاں ہر قسم کی برائی اور تشدد پھیلے گا۔ نفرت کے ساتھ کبھی کوئی خوبی کی چیز جمع نہیں ہو سکتی۔

کرنے کا اصل کام

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے موجودہ قسم کی سیاسی ہنگامہ آرائی یا تشدد نہ صرف یہ کہ غیر اسلامی ہے، بلکہ وہ انتہائی حد تک بے فائدہ بھی ہے۔ قریبی ماضی کی تاریخ اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، بیسویں صدی کے نصف اول میں بیشتر مسلم ممالک مغربی طاقتوں کے زیر اقتدار تھے، خواہ براہ راست طور پر یا بالواسطہ طور پر۔ اس کے بعد آزادی کی تحریکیں چلیں۔ آج یہ تمام مسلم ممالک سیاسی طور پر آزاد ہیں۔ ان ملکوں کی تعداد تقریباً ۶۰ تک پہنچ چکی ہے۔ گنتی کے اعتبار سے اقوام متحدہ کے ممبروں میں سب سے زیادہ تعداد مسلم ملکوں کی ہے۔ اس

کے باوجود عالمی سیاسی نقشہ پر مسلمانوں کا کوئی وزن نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں سیاسی اقتدار ہی سب کچھ ہوا کرتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں سیاسی اقتدار کی حیثیت ثانوی بن گئی ہے۔ اب تعلیم اور سائنس اور ٹکنالوجی اور اقتصادیات کی اہمیت ہے۔ صرف سیاسی طور پر آزاد ہونا آج کی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

موجودہ مسلم ممالک چونکہ ان غیر سیاسی شعبوں میں دوسری قوموں سے پچھڑے ہوئے ہیں اس لئے عالمی نقشہ میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ ان کے عوام ابھی تک زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں وہ ابھی تک مغربی ملکوں کے محتاج ہیں۔ جدید معیار کے اعتبار سے انھیں اقتصادی ترقی حاصل نہیں۔ بظاہر سیاسی اقتدار کا مالک ہونے کے باوجود وہ زندگی کے تمام جدید شعبوں میں پچھڑے ہوئے ہیں۔ وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں حدیث کے مطابق صرف ید سفلیٰ (نچلا ہاتھ) بنے ہوئے ہیں۔ آزادی کے باوجود وہ عملاً محکومی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔

مزید چشم کشا مثال یہ ہے کہ بہت سے مسلم ملک ہیں جہاں ان کے دعویٰ کے مطابق مفروضہ اسلامی انقلاب آچکا ہے۔ مثلاً مصر، پاکستان، ایران، الجزائر، سوڈان، افغانستان، وغیرہ۔ مگر اصل مسئلہ کی نسبت سے یہ نام نہاد اسلامی ممالک بھی انہیں سنگین مسائل کا شکار ہیں جن کا شکار دوسرے مسلم ممالک ہیں جن کو سیکولر کہا جاتا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ علمی اور اقتصادی شعبوں میں یہ نام نہاد اسلامی ممالک بھی اتنا ہی پچھڑے ہوئے ہیں جتنا کہ دوسرے سیکولر ممالک۔ اس لئے آج کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی مسلم نسلوں کو ان غیر سیاسی شعبوں میں آگے بڑھایا جائے۔ اور بلاشبہ یہ سب غیر سیاسی کام ہیں، ان کا سیاست اور اقتدار سے کوئی تعلق نہیں۔ مزید یہ کہ ان غیر سیاسی کاموں میں عمل کرنا خالص امن کے دائرہ میں ممکن ہے۔ ان میدانوں میں متحرک ہونے کے لئے نہ نفرت پھیلانے کی ضرورت ہے اور نہ تشدد بھڑکانے کی۔ یہ سارے مثبت نوعیت کے کام ہیں، ان کا منفی سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک خط

برادر محترم و مکرم جناب یوسف نورانی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا خط مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۹۹ بذریعہ فیکس ملا۔ آپ نے جس مسئلہ کی بابت تحریر فرمایا ہے اس پر میں نے کافی غور کیا۔ اس سلسلہ میں چند باتیں مختصر طور پر یہاں درج کرتا ہوں۔

۱۔ قرآن کی سورۃ الواقعہ (آیت ۸۳۔۸۵) میں بتایا گیا ہے کہ موت سے کچھ پہلے جب کہ آدمی ابھی اسی دنیا میں ہوتا ہے تو اس کا تعلق آخرت سے قائم ہو جاتا ہے۔

اسی طرح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جب موت کے قریب پہنچتا ہے تو اس کے مردہ رشتہ دار اس کو لینے کے لئے اس کے پاس آجاتے ہیں۔ اس طرح کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ انسانوں کا مردہ روحوں سے تعلق کسی نہ کسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے اگرچہ یہ تعلق وقتی اور جزئی قسم کا ہوتا ہے۔

۲۔ دونوں دنیاؤں کے درمیان اس ربط کا کوئی تعلق کسی قسم کی عملیات یا مشق (exercise) سے نہیں۔ وہ خود بخود اور کبھی کبھی ہوتا ہے۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ زندہ انسان کی روحانی تطہیر (spiritual purification) کتنی زیادہ ہوئی ہے۔ زندہ انسان کی جتنی زیادہ تطہیر ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ ارواح سے ربط کے قابل ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ دوسری دنیا کے پیغام کا آخذ (recipient) بنے گا۔ تاہم یہ ربط ارادۃً نہیں بلکہ اتفاقاً ہوتا ہے۔

۳۔ زندہ انسان اور مردہ انسان کی روح کے درمیان یہ ربط کبھی لمحاتی طور پر عالم بیداری میں بھی ہو سکتا ہے مگر اس قسم کا ربط انتہائی نادر استثناء (rare exception) ہے۔ زیادہ تر یہ ربط خواب کی صورت میں ہوتا ہے جس کو حدیث میں نبوت کا چھیالیسواں حصہ بتایا گیا ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے زندہ لوگوں کو اس قسم کے خواب دکھائی دیئے جن کا کچھ تذکرہ ابن قیم کی کتاب الروح میں دیکھا جا سکتا ہے، خود میں نے بھی بعض ایسے خواب دیکھے ہیں جب کہ

خواب میں کسی مردہ رشتہ دار سے میری ملاقات ہوئی۔ مگر اس قسم کا ربط کسی عملیاتی مشق کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف اتفاقی طور پر کسی کو پیش آسکتا ہے۔ مزید یہ کہ خواب کا ذریعہ صرف ظنّی ہے۔ وہ وحی کے مانند حقیقی نہیں۔

۴۔ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد کوئی عورت یا مرد فوراً ہی اپنے اخروی انجام سے دوچار ہو جاتا ہے، حدیث میں آیا ہے کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔ اس سے مراد معروف معنوں میں زمینی قبر کا مقام نہیں ہے۔ یعنی مرنے والے انسان کے اوپر یہ معاملہ قبر کے اندر نہیں ہوتا بلکہ آخرت میں ہوتا ہے۔ قبر عالم آخرت میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ موت اور انجامِ آخرت میں کوئی فاصلہ نہیں تاہم یہ بات صرف اجمالی طور پر جانی جا سکتی ہے نہ کہ تفصیلی طور پر۔

۵۔ قرآن میں شہداء کے بارے میں آیا ہے کہ و یستبشرون بالذین لم یلحقوا بھمْ من خلفھم (آل عمران ۱۷۰) اس آیت کا ترجمہ ایک فارسی مترجم نے اس طرح کیا ہے: و مژدہ می دہند بآنانکہ ہنوز نرسیدہ اند (صفحہ ۹۶) یعنی جنت میں پہنچنے کے بعد وہ دنیا میں باقی رہنے والے ساتھی کو خوش خبری دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندہ مومن اور وفات یافتہ اہل جنت کے درمیان ایک مخفی قسم کا ارتباط (communication) باقی رہتا ہے۔ تاہم اس ارتباط کی کوئی مشقی تدبیر نہیں۔ ایسا واقعہ صرف کسی نفس مطمئن (complex-free soul) کے ساتھ پیش آتا ہے۔

۶۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: "اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی ذریت بھی ان کی راہ پر ایمان کے ساتھ چلی، ان کے ساتھ ہم ان کی ذریت کو بھی جمع کر دیں گے، اور ان کے عمل میں سے کوئی چیز کم نہیں کریں گے"۔ (الطور ۲۱) اس سے معلوم ہوا کہ اہل خاندان، مثلاً میاں اور بیوی دونوں اگر صاحب ایمان ہیں تو آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اس طرح رحمت کا معاملہ فرمائے گا کہ کم عمل والے فرد کو اپ گریڈ (upgrade) کر کے اس کو زیادہ عمل والے فرد کے درجہ میں پہنچا دے گا تاکہ دونوں ایک ساتھ جنت کی پر مسرت دنیا میں رہ سکیں۔ گویا کہ اگر دونوں میں سے ایک کا عمل دوسرے سے زیادہ ہو تو کم عمل والا زیادہ عمل والے کے ساتھ جوڑ دیا

جائے گانہ کہ اس کے برعکس۔ واضح ہو کہ قرآن میں وسیع تر تقسیم (broad، division) کے اعتبار سے جنت کے دو درجے بتائے گئے ہیں۔ پھر ان کی ضمنی تقسیمات ہیں۔ چنانچہ حدیث میں دو سو جنتوں کا ذکر آیا ہے۔

۷۔ ایک مومن جوڑے میں سے اگر ایک فرد کا انتقال ہو گیا اور دوسرا باقی ہے تو زندہ رہنے والے فرد کے لئے بہترین کام یہ ہے کہ وہ اپنی بقیہ زندگی کو دونوں ہی کے لیے ایک نادر موقع سمجھے۔ وہ اپنی بقیہ زندگی کو اعلیٰ اسلامی عمل میں مصروف کر دے تاکہ اس کو جب اپنے زیادہ عمل کی بنا پر زیادہ اعلیٰ جنت ملے تو اس کا جوڑا بھی مذکورہ خدائی قانون کے مطابق اپ گریڈ (upgrade) ہو کر اس کے ساتھ اس اعلیٰ جنت میں پہنچا دیا جائے۔ گویا کہ ایک اگر اکانومی کلاس میں ہے اور دوسرا فرسٹ کلاس میں تو اکانومی کلاس والا اپ گریڈ ہو کر فرسٹ کلاس میں پہنچ جائے۔

قرآن کی یہ آیت اہل ایمان کے لیے ایک عظیم خوشخبری ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ زندہ رہنے والا فرد اپنے مرنے والے ساتھی کے غم میں اپنے کو نڈھال نہ کرے۔ وہ اس کی یاد میں پریشان ہو کر اپنے باقی ماندہ وقت کو ضائع نہ کرے۔ بلکہ اپنے ساتھی کی موت کے بعد اس کو زندگی کا جو لمحہ ملا ہے اس کو وہ دونوں ہی کے حق میں ایک قیمتی موقع (opportunity) سمجھے۔ وہ اس ملے ہوئے وقت کو اپنی اور اپنے مرحوم ساتھی کی جنتی ترقی کے لئے استعمال (avail) کرے۔

دعاگو

وحیدالدین

تاریخ: ۱۵ مارچ ۱۹۹۹

سوال

الرسالہ (اردو) دسمبر ۱۹۹۹ کے صفحہ نمبر ۳۴ پر کچھ غیر مسلموں کے استفسار پر کہ "پیغمبر اسلام آخری پیغمبر ہیں۔ اس کی دلیل کیا ہے" جواب میں آپ نے ان سے کہا کہ "کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا۔ جس نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ یہی واقعہ اس کی تاریخی دلیل ہے۔" ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ماضی میں جن لوگوں نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا، ان کے اس دعویٰ کے بارے میں آپ کیا جواز پیش کریں گے۔ مثلاً مسیلمہ کذاب اور غلام احمد قادیانی وغیرہ وغیرہ۔ اس معاملہ کی وضاحت فرمائیں۔ (عبدالقیوم شارق، مرتضیٰ پور، مہاراشٹر)

جواب

میرا کہنا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی شخص نے مستقل بالذات نبوت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یعنی کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ رسول اللہ کے ہم عصر مسیلمہ بن حبیب الحنفی (وفات ۶۳۳ء) نے مستقل نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ یہ کہا تھا کہ: إني قد اشركت في الامر معه۔ سیرۃ ابن ہشام ۴/۲۴۴۔ (یعنی میں محمدؐ کے ساتھ نبوت میں شریک کیا گیا ہوں)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسیلمہ کے دعویٰ کے مطابق اس کی نبوت کا معاملہ خود پیغمبر کی تصدیق پر منحصر تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے دو آدمیوں کا وفد رسول اللہ کے پاس مدینہ بھیجا تاکہ اپنے بارے میں وہ آپؐ کی تصدیق حاصل کرے۔ آپ نے مسیلمہ کو کاذب قرار دیا اس کے بعد اس کی نبوت کا دعویٰ اپنے آپ بے بنیاد ثابت ہو گیا۔ اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی (وفات ۱۹۰۸) نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ اس نے ظلِّ نبوت ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ یعنی میں محمدؐ کی نبوت کا سایہ ہوں۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیشگی طور پر فرما چکے ہیں کہ: لیس بعدی نبی (صحیح البخاری، کتاب المغازی)۔ یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اس لئے مرزا غلام احمد کا دعویٰ بھی رسول اللہ کی تصدیق پر منحصر تھا اور آپ کی پیشگی تردید کی بنا پر یہ دعویٰ اپنے آپ باطل قرار پا گیا۔ اسی طرح ایران کے بہاء اللہ (وفات ۱۸۹۲ء) کے بارے

میں سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔ انھوں نے اپنی زبان سے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ انھوں نے صرف یہ کہا تھا کہ میں "مظہر الٰہی" ہوں۔ اس بنا پر وہ دعویٰ کے درجہ میں بھی اس فہرست میں نہیں آتے۔

اس سلسلہ میں مجھے ذاتی طور پر دو تجربے ہوئے ہیں۔ پہلا تجربہ نرنکاری مشن (نئی دہلی) کے گرو گربچن سنگھ (وفات ۱۹۸۰) کے بارے میں ہے۔ ۱۹۷۵ میں نرنکاری مشن کے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور انہوں نے انگریزی میں چھپا ہوا ایک پمفلٹ مجھے دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ بابا گربچن سنگھ وقت کے پیغمبر (Prophet of the Time) ہیں۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ میں آپ کے سنٹر میں آؤں گا اور بابا گربچن سنگھ میرے سامنے یہ جملہ کہیں کہ 'میں وقت کا پیغمبر ہوں'۔ آپ لوگ باباجی سے بات کر کے تاریخ اور وقت مقرر کر دیں تا کہ میں اس وقت وہاں پہنچ سکوں۔ ان لوگوں نے باباجی سے گفتگو کر کے تاریخ اور وقت طے کیا اور پھر مجھے ٹیلیفون پر مطلع کیا۔ اس کے مطابق میں باباجی کے یہاں پہنچا۔ میں باباجی کے پاس ۴۵ منٹ تک رہا مگر انھوں نے اپنی زبان سے یہ نہیں کہا کہ میں وقت کا پیغمبر ہوں، اس کے بجائے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، آخر کار میں واپس چلا آیا۔

میرا دوسرا تجربہ شانتی گری آشرم (ترونڈرم) کے گروجی کے بارے میں ہے۔ وہ ٦ مئی ۱۹۹۹ کو اپنے آشرم میں انتقال کر گئے۔ مارچ ۱۹۹۹ میں ان کے یہاں ایک کانفرنس ہوئی۔ ان کے کچھ شاگرد دہلی آئے اور مجھ سے مل کر مجھے اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ انھوں نے شانتی گری آشرم کے تعارف پر ایک انگریزی پمفلٹ مجھے دیا جس میں یہ لکھا تھا کہ گروجی وقت کے پیغمبر ہیں۔ میں نے کہا کہ میں آپ کی کانفرنس میں آؤں گا اور میرا خاص مقصد یہ ہوگا کہ میں آپ کے گروجی سے اس دعویٰ کی بابت سوال کروں۔ وہ خوشی سے راضی ہو گئے۔ میں سفر کر کے شانتی گری آشرم پہنچا جو تریوندرم ایرپورٹ سے تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک سو ایکڑ رقبہ میں واقع ہے۔ یہاں میں نے دو دن قیام کیا۔ اس درمیان میں گروجی سے میری دو بار ملاقات

ہوئی۔ایک ملاقات میں ان کی شاگردوں کے موجودگی میں باباجی سے میں نے یہ سوال کیا:

Do you claim that you are a prophet of God in the same sense in which Moses, Jesus and Mohammad claimed to be prophets of God.?

میرے اس سوال کے جواب میں باباجی نے صاف طور پر کہا کہ نہیں، (No) میں ایسادعویٰ نہیں کرتا۔یہ دوسروں کے اوپر ہے کہ وہ میرے بارے میں کیارائے قائم کرتے ہیں۔اس گفتگو کے بعد میں نے ان کے مذکورہ شاگردوں سے کہاکہ جب آپ کے باباجی پیغمبر ہونے کادعویٰ ہی نہیں کرتے تو آپ لوگ کیسے انہیں پیغمبر بتاتے ہیں۔اگر خداکسی کواپنا پیغمبر بنائے توسب سے پہلے خوداس آدمی کواپنے پیغمبر ہونے کا علم ہوگا جس کو پیغمبر بنایا گیاہے،نہ کہ اس کے سوادوسرے لوگوں کو۔

اپنے مطالعہ اور تجربہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ کہنا کہ "میں خداکا پیغمبر ہوں" ہمالیہ پہاڑ اپنے سر پر اٹھانے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔اس قسم کا جملہ وہی بول سکتا ہے جو واقعۃً خداکا پیغمبر ہو۔غیر پیغمبر ایسا جملہ بولنے کی ہمت ہی نہیں کرسکتا۔

سوال

آپ اکثرالرسالہ میں لکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے مواقع کھل گئے ہیں اور بلا روک ٹوک اسلامی دعوت کا کام کیا جاسکتا ہے۔ مگر کچھ لوگ ہیں جو اس کے خلاف بتاتے ہیں۔ مثلاً ایک مسلم حلقہ کے ایک شاعر نے اپنے حلقہ کے فکر کی ترجمانی ایک شعر میں اس طرح کی ہے:

جس نے بھی بات کی ہے نبی کے نظام کی سننی پڑی ہے طنزاسے خاص وعام کی

آخر یہ دوطرح کی بات کیوں۔دونوں میں سے کون سی بات صحیح ہے۔(ایک قاری الرسالہ،دہلی)

جواب

اس قسم کے اشعار سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ شعر توایک لفظی تک بندی ہوتا ہے۔اور لفظی تک بندی آپ جس طرح چاہیں کرسکتے ہیں، حتی کہ متضاد انداز میں بھی۔ مثلاً مذکورہ شعر کولفظ بدل کراس طرح برعکس طور پر بھی کہا جاسکتا ہے:

جس نے بھی بات کی ہے نبی کے نظام کی اس کوملی ہے داد خواص وعوام کی

آپ تاریخ کی روشنی میں دیکھیں تو معاملہ بالکل مختلف نظر آئے گا۔ یہ ایک مسلّم تاریخی حقیقت ہے کہ نبی کی "بات" بیان کرنے والوں میں سے سب سے بڑا گروہ محدثین کا ہے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ صحابہ کرام کے بعد امت میں سب سے زیادہ عزت واحترام جس کو ملا ہے وہ یہی محدثین کا گروہ ہے۔ حتی کہ آج بھی کسی دار العلوم کے شیخ الحدیث کو جو مقبولیت حاصل ہوتی ہے وہ کسی اور کو نہیں ملتی اصل یہ ہے کہ مذکورہ شعر یا اس قسم کی بات کہنے والے دوسرے حضرات ایک مغالطہ کا شکار ہیں۔ وہ "نبی کی بات" اور "نبی کے نام پر اپنی بات" کے فرق کو نہیں جانتے۔ نبی کی بات کو کہنا یا نبی کے اصل پیغام کو پہنچانا ہمیشہ لوگوں کے درمیان پسندیدہ کام رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو لوگ "نظام مصطفیٰ" کے نام پر تحریکیں چلاتے ہیں اور ان کو مسائل کا شکار ہونا پڑتا ہے اس کا تعلق "نبی کی بات" سے نہیں ہے بلکہ نبی کے نام پر حکمرانوں کے خلاف ٹکراؤ کی سیاست چلانے سے ہے۔ اور ٹکراؤ کی سیاست ہمیشہ ٹکراؤ پیدا کرتی ہے۔ "نظام مصطفیٰ کے خود ساختہ علم بردار لوگ خود اپنی غیر پیغمبرانہ سیاست کی قیمت پا رہے ہیں اور اس کو خلاف واقعہ طور پر پیغمبر سے منسوب کرتے ہیں، صرف اس لئے کہ انہوں نے اپنی یہ غیر پیغمبرانہ سیاست پیغمبر کے نام پر چلائی تھی۔

سوال

مسلمان اپنے آپ کو ہندو کہلانا کیوں ناپسند کرتے ہیں۔ ہندو کوئی مذہبی شبد نہیں۔ یہ ایک جغرافی شبد ہے۔ بھارت کے جغرافیہ میں جو لوگ رہتے ہیں وہ سب ہندو ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح جرمنی کے جغرافیہ میں رہنے والے سب جرمن ہیں۔ اس دیش میں ہندو اور مسلمان دونوں ہندو ہیں۔ مسلمان اگر اس بات کو مان لیں تو ہمارے دیش کا سارا جھگڑا ختم ہو جائے اور یہاں سماجی امن قائم ہو جائے (ایم۔ ایس۔ شرما، نئی دہلی)

جواب

جرمنی میں رہنے والے تمام لوگ اس لئے جرمن کہے جاتے ہیں کہ ان کے کانسٹی ٹیوشن میں ایسا لکھا ہوا ہے۔ مگر انڈیا کے کانسٹی ٹیوشن میں ایسا نہیں۔ اس کے مطابق اس ملک میں رہنے والے

سب لوگ انڈین یا بھارتی ہیں۔ لہذا جرمن اور ہندو کے معاملہ کو یکساں کیسے بتایا جاسکتا ہے۔

اس معاملہ کی دوسری نظریاتی بنیاد یہ ہو سکتی تھی کہ یہاں کی قدیم کتابوں میں ایسا لکھا ہوا ہو۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، ویدیا پران یا گیتا میں یہ لکھا ہوا نہیں ہے کہ اس دیش میں رہنے والے سب کے سب ہندو ہیں۔ بلکہ ہندو کا شبد تو ان کتابوں میں موجود ہی نہیں۔ پھر آخر وہ کون سی نظریاتی دلیل ہے جس کی بنیاد پر ایسا کہا جائے۔

محض کسی کا دعویٰ اس تصور کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ ورنہ دوسرے لوگ بھی ایسا ہی دعویٰ کر سکتے ہیں۔ مثلاً عیسائی لوگ کہہ سکتے ہیں کہ عیسائی ان کا مذہبی نام نہیں ہے۔ ان کا اپنا اختیار کردہ نام مسیحی یا کرسچین ہے۔ عیسائی دراصل ایک جغرافی شبد ہے اور اس ملک کے رہنے والے سب کے سب عیسائی ہیں۔ اگر محض دعویٰ کافی ہو تو ہر گروہ اس قسم کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

جہاں تک سماجی امن کا تعلق ہے، اس کا ہندو نظریہ سے کوئی تعلق نہیں۔ محض کسی لفظ کے ادل بدل سے سماجی جھگڑے کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ مہاتما گاندھی اور گاڈسے دونوں اپنے کو ہندو کہتے تھے، اس کے باوجود گاڈسے نے گاندھی کو مار ڈالا۔ بہار کے اونچی ذات کے ہندو اور نیچی ذات کے ہندو دونوں اپنے کو ہندو کہتے ہیں۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اٹل بہاری باجپئی اور کلیان سنگھ دونوں مذکورہ معنوں میں اپنے کو ہندو بتاتے ہیں۔ اس کے باوجود دونوں میں اتنا اختلاف پیدا ہوا کہ دونوں الگ الگ ہو گئے۔

صحیح بات یہ ہے کہ اس قسم کے کلچرل اختلاف کو مٹانے کے بجائے اس معاملہ میں ہر ایک کو آزادی دے دی جائے۔ گرو گولوالکر نے درست طور پر کہا تھا کہ فطرت یکسانیت سے نفرت کرتی ہے: Nature abhors uniformity۔ اور جب خود فطرت ہی میں فرق اور تنوع موجود ہے تو اس کو مٹانا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سماجی امن کا راز کلچرل یکسانیت میں نہیں ہے بلکہ کلچرل تنوع کو تسلیم کرنے میں ہے۔ اس مسئلہ کے حل کا درست اور قابل عمل فارمولا صرف یہ ہے: ایک کی پیروی اور سب کا احترام: .Follow one and respect all

توجیہہ یا بددیانتی

دہلی کے انگریزی اخبار پانیر (۱۷ ستمبر ۱۹۹۹) میں صفحہ اول پر ایک رپورٹ چھپی۔ اس کے مطابق، ہندستان ٹائمس کے ایڈیٹر وی این نرائنن (V. N. Narayanan) کا ایک مضمون ہندستان ٹائمس کے کالم میوزنگس (Musings) میں چھپا، وہ ایک ادبی سرقہ (Plagiarism) تھا۔ یہ ایک مغربی مصنف برائن اپل یارڈ (Bryan Appleyard) کا مضمون تھا جس کو مسٹر نرائنن نے اپنے نام کے تحت لفظ بلفظ (verbatim) شائع کر دیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد جب اس ادبی سرقہ کا چرچا ہوا تو مسٹر نرائنن نے ہندستان ٹائمس کی ادارت سے ضمیر کی بنیاد (conscience ground) پر استعفیٰ دے دیا۔ تاہم انھوں نے اپنے اس فعل کی توجیہہ کرتے ہوئے یہ کہا کہ: میں خیالات کا ناقل ہوں اور جب میں کسی خیال کو کسی سے لفظ بلفظ لیتا ہوں تو میں ذاتی طور پر اس آدمی کو خراج عقیدت پیش کر رہا ہوتا ہوں۔ میں مصنف کو اپنی ذات میں شامل کر لیتا ہوں۔ جب ایک خیال میڈیا میں آجائے تو وہ عوامی ملکیت بن جاتا ہے:

> I am a carrier of ideas and when I take an idea verbatim from someone, I am personally paying homage to the person who has expressed it. I personalise the author, I get into the person. Once an idea is expressed in the media it is public property.

یہ بلاشبہہ ایک جھوٹی توجیہہ ہے۔ اس دنیا میں غلطی کرنا صرف غلطی ہے۔ مگر غلطی کے بعد اس کی جھوٹی توجیہہ پیش کرنا بددیانتی۔ غلطی قابل معافی ہو سکتی ہے مگر بددیانتی (dishonesty) ہرگز قابل معافی نہیں۔

۱۔ نو بھارت ٹائمس (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر اوم پرکاش تپس نے ۴ اکتوبر ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ موضوع تھا: اسلام اور تیوہار۔ بتایا گیا کہ اسلام میں عید اور عید الاضحیٰ کی ایک حیثیت مذہبی ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ سماجی میل اور انسانی تعلقات کی بہتری کا ذریعہ ہے۔

۲۔ انڈونیشیا (جکارتا) میں آنند آشرم کے نام سے میڈیٹیشن (Meditation) کے مقصد کے تحت ایک بڑا ادارہ قائم ہے جس کا پورا نام یہ ہے:

Center for Holistic Health and Meditation

اس ادارہ کے تحت ایک درجن افراد انڈیا آئے۔ وہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ وفد مسٹر آنند کرشنا کی قیادت میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز سے ملا۔ وہ اسلام کے بارے میں سمجھنا چاہتے تھے۔ ان کو تفصیل کے ساتھ اسلام سے متعارف کیا گیا۔ ایک گھنٹہ کی یہ پوری بات چیت انگریزی میں ہوئی جس کو انھوں نے ریکارڈ کیا۔

۳۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۹۹ کو کیتھولک چرچ کی طرف سے کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ایک اجتماع کیا گیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور وہاں مختلف مذاہب کے مشترک اجتماع میں ایک تقریر کی۔ اس میں انھوں نے قرآن اور روحانیت کی اہمیت بتائی۔ ایک بات یہ کہی گئی کہ انسان پیدائشی طور پر امن اور روحانیت کی فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اسلام میں صبر کی تعلیم اس لئے دی گئی ہے کہ یہ فطرت بگڑنے نہ پائے۔

۴۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۹ کو تارا بھٹا چارجی، ممبر، کھادی اینڈ ولیج انڈسٹری کمیشن کی رہائش گاہ پنچ شیل پارک (نئی دہلی) پر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں کچھ بیرونی ملکوں کے لوگ بھی شریک تھے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام کی سماجی تعلیمات پر ایک تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام

انسانوں کو یکساں طور پر خدا کی مخلوق سمجھو۔ لوگوں سے تمہیں ناخوشگواری کا تجربہ ہو تب بھی تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ دوسروں کی طرف سے منفی رویہ کا اظہار ہو تب بھی تم مثبت رویہ پر قائم رہو۔

۵۔ پوپ جان پال کی دہلی آمد پر مسٹر ٹی پی پانڈے نے IN T. V. کے لئے یکم نومبر ۱۹۹۹ کو ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام میں ہر مذاہب کے بزرگوں کے احترام کی تعلیم دی گئی ہے۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ تم کو خواہ کسی سے مذہبی اختلاف ہو تب بھی انسان کی حیثیت سے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور بلا تفریق ہر قوم کے بڑوں کی عزت کرو۔

۶۔ پروفیسر راج موہن گاندھی کی ۴۶۳ صفحات کی کتاب (Revenge and Reconciliation) حال میں پنگوئن بکس نے چھاپی ہے۔ اس سلسلہ میں ۱۲ نومبر ۱۹۹۹ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر نئی دہلی میں ایک پینل ڈسکشن منعقد کیا گیا۔ اس میں دلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کتاب میں ساؤتھ ایشیا کی دوسری تہذیبوں کے ساتھ اسلام کے بارے میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ اس کی تاریخ میں تشدد زیادہ ہے اور صلح کم۔ اس سلسلہ میں کہا گیا کہ اس معاملہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ نیچر کا اصول شاک ٹریٹمنٹ کا ہے۔ دنیا میں جتنی بھی ترقیاں ہوئی ہیں وہ سب شاک ٹریٹمنٹ کے ذریعہ ہوئی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ چیز جس کو تشدد کہا گیا ہے وہ در حقیقت زحمت میں رحمت (blessing in disguise) ہے۔

۷۔ نیشنل یوتھ سنٹر (نوائیڈہ) میں ۱۴ نومبر ۱۹۹۹ کو ایک سیمنار ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور سکولرزم اور ہندستان کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان کے لئے سکولر نظام ہی واحد صحیح نظام ہے۔ اس لئے نہیں کہ اقلیتوں کے لئے اس میں تحفظ ہے بلکہ

اسی میں خود ملک کا فائدہ ہے۔ آج ساری دنیا میں سکولر اسٹیٹ کو پسند کیا جاتا ہے۔ اور مذہبی اسٹیٹ کو بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہندستان میں مذہبی اسٹیٹ بنائی جاتی تو یہ ملک عالمی برادری سے الگ ہو جاتا۔ اور عالمی سطح پر اپنا وزن کھو دیتا۔

۸۔ مولانا ابو الکلام آزاد سنٹر کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے احمد آباد کا سفر کیا۔ ۱۹۔ ۲۰ نومبر کو وہاں مختلف پروگرام ہوئے۔ ۲۰ نومبر کو سنٹر کے ہال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اجتماع میں تفصیلی خطاب ہوا۔ اس سفر کی روداد سفر نامہ کے تحت انشاء اللہ شائع کر دی جائے گی۔

۹۔ نور الاسلام فاؤنڈیشن (فلوریڈا) کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز کا امریکہ کا سفر ہوا۔ یہ سفر ۲۳ نومبر ۱۹۹۹ کو شروع ہوا اور ۸ دسمبر ۱۹۹۹ کو واپسی ہوئی۔ اس سفر میں امریکہ کے مختلف مقامات پر دعوتی پروگرام ہوئے۔ ہر پروگرام کے موقع پر اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات کا بک اسٹال بھی لگایا گیا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ سفر نامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۰۔ جیز زاینڈ میری کالج (نئی دہلی) میں ۱۰ دسمبر ۱۹۹۹ کو مختلف مذاہب پر ایک خصوصی پروگرام تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور اسلام کے تعارف پر ایک تقریر کی۔ یہ پروگرام انگریزی میں تھا۔

۱۱۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۹ کو دوردرشن (انٹر نیشنل) کی ٹیم نے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ریکارڈ کی۔ اس کا موضوع 'روزہ اور انسانیت' تھا تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ روزہ ایک اعتبار سے اللہ سے قربت کا ذریعہ ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ سلف کنٹرول اور اخلاقی ڈسپلن کی تربیت ہے تاکہ انسان اپنے سماج کا بہتر فرد بن کر رہ سکے۔

۱۲۔ صدر اسلامی مرکز کے سفر امریکہ کے دوران بی بی سی لندن نے ٹیلی فون پر ان کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا تھا۔ یہ انٹرویو ۲۹ دسمبر ۱۹۹۹ کو بی بی سی کی صبح کی خبروں کے تحت نشر کیا گیا۔ اس

انٹرویو کا موضوع تھا: دنیا کیسے تخلیق ہوئی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے قرآن کی آیتوں کی روشنی میں بتایا کہ دنیا کی تخلیق کے بارہ میں قرآن میں کیا تصور دیا گیا ہے۔

۱۳۔ ان ٹائم ٹی وی نیوز (نئی دہلی) (In Time T. V. News) کی ٹیم نے ۳۰ دسمبر ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ اگلی شتابدی کیسی ہوگی۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ فطرت کا قانون ہمیشہ ارتقاء کی طرف جاتا ہے۔ اس لئے انسان کی تاریخ بھی اگلی صدیوں میں یقینی طور پر ارتقاء کی طرف جائے گی۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی میں اقوام متحدہ وجود میں آئی۔ اس طرح حالات بتاتے ہیں کہ اگلی صدی میں روحانیت کا غلبہ اسی طرح ہوگا جس طرح بیسویں صدی میں مادیت کا غلبہ تھا۔ اور یہ قانون فطرت کے تحت ہوگا۔

۱۴۔ دوردرشن (نئی دہلی) نیوز چینل کے لئے یکم جنوری ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا گیا۔ اس کا موضوع تھا: ہائی جیکنگ اور اسلام۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہائی جیکرس کا حکم اسلام میں وہی ہے جو قطاع الطریق (Highway robbers) کا ہے۔ اس قسم کا فعل اسلام میں بلاشبہہ جائز نہیں۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہا گیا کہ جہاد (بمعنی قتال) صرف حکومت کا کام ہے، وہ افراد کا کام نہیں ہے۔

۱۵۔ یکم جنوری ۲۰۰۰ کو مارکیٹ (نئی دہلی) میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ یہ رمضان کی ۲۲ تاریخ تھی۔ اس نسبت سے روزہ کا حکم اور اس کے روحانی پہلو پر صدر اسلامی مرکز نے ایک تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ روزہ سلف کنٹرول کی ایک سالانہ تربیت ہے۔ حقیقی روزہ وہی ہے جس میں اس کے فارم کے ساتھ اس کی مطلوب اسپرٹ بھی موجود ہو۔

۱۶۔ شری رام اسکول (گڑگاؤں) میں ۱۲ جنوری ۲۰۰۰ کو طلبہ اور ساتذہ کا ایک خصوصی پروگرام تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام کے تعارف پر ایک تقریر کی۔ تقریر کے آخر میں سوال و جواب ہوا۔ اسکول کے اس پروگرام کے تحت

مختلف مذہب کے مستند عالموں کو بلا کر انھیں یہ موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کا تعارف پیش کریں۔ چنانچہ اسلام کے تعارف کے لئے صدر اسلامی مرکز کو بلایا گیا۔

۱۷۔ زی ٹی وی (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۱۳ جنوری ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر 'اسلام اور آتنک واد' سے تھا۔ جواب میں کہا گیا کہ آتنک واد کا کوئی بھی تعلق اسلام سے نہیں ہے۔ اسلام ایک امن پسند مذہب ہے۔ اور اپنے مقصد کو صرف پرامن ذرائع سے حاصل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

۱۸۔ سیرین میڈیا کے نمائندہ ڈاکٹر وائل الشیخ حسن عواد نے ۱۳ جنوری ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک ویڈیو انٹرویو انگریزی میں ریکارڈ کیا۔ اس کا سبجکٹ تھا: تقسیم اور ہند۔پاک تعلقات۔ اس تفصیلی انٹرویو میں جو باتیں کہی گئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ہندو یا انگریز کو تقسیم کا ذمہ دار قرار دینا درست نہیں۔ جس لیڈر شپ نے تقسیم کا مطالبہ کیا وہی اس کی اصل ذمہ دار ہے۔ یہ دنیا مسابقت کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی اس انتظار میں ہے کہ آپ اپنے کسی فعل سے اس کو موقع دیں تو وہ اس کو اپنے حق میں استعمال کرے۔ اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ مسلم لیڈر شپ نے موقع فراہم کیا اور پھر دوسروں نے اس کو استعمال کیا۔ مسلم لیڈر شپ کو دوسروں کی شکایت کرنے کے بجائے یہ جاننا چاہئے کہ اس دنیا میں آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ ایسا کوئی فعل نہ کرے جس سے دوسروں کو اسے استعمال کرنے کا موقع مل جائے۔

۱۹۔ بی بی سی لندن کے لئے مسٹر زبیر احمد نے ۱۳ جنوری ۲۰۰۰ کو لندن سے بذریعہ ٹیلی فون صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم۔مسیحی تعلقات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں یہ کہا گیا کہ مسیحی لوگ اگر زیادتی کریں تو مسلمانوں کو یکطرفہ طور پر اسے نظر انداز کرنا چاہئے تاکہ دعوت کا ماحول باقی رہے۔ دعوت کا عمل صرف دونوں کے درمیان نارمل تعلقات میں ہو سکتا ہے۔ اور نارمل تعلق کو باقی رکھنے کے لئے سب سے زیادہ ذمہ داری مسلمانوں کو اٹھانا چاہئے کیونکہ ان کی حیثیت داعی کی ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 90	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs. 170	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs. 250	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs. 400	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	£50 / $100	

ISLAMIC BOOKS

Books by Maulana Wahiduddin Khan

Title	Price
Islam and Peace	Rs. 150.00
Principles of Islam	145.00
The Quran for All Humanity	75.00
Indian Muslims	65.00
God Arises	125.00
Islam: The Voice of Human Nature	40.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	145.00
Woman in Islamic Shari'ah	80.00
Islam As It Is	70.00
An Islamic Treasury of Virtues	195.00
Religion and Science	45.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
The Way to Find God	25.00
The Teachings of Islam	50.00
The Good Life	45.00
The Garden of Paradise	45.00
The Fire of Hell	45.00
Islam and the Modern Man	25.00
Uniform Civil Code	10.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	195.00
A Treasury of the Qur'an	75.00
Words of the Prophet Muhammad	75.00
Qur'an: An Abiding Wonder	145.00
The Call of the Qur'an	95.00
The Moral Vision	145.00
Introducing Islam	195.00

Title	Price
The Qur'an Tr. T.B. Irving	Rs. 295.00
The Koran Tr. M.H. Shakir	195.00
Heart of the Koran by Lex Hixon	195.00
The Moral Values of the Quran by Harun Yahya	125.00
The Basic Concepts in the Quran by Harun Yahya	—
The Essential Arabic by Rafi'el-Imad Faynan	200.00
Presenting the Qur'an by Saniyasnain Khan	125.00
The Wonderful Universe of Allah by Saniyasnain Khan	85.00
The Soul of the Qur'an by Saniyasnain Khan	145.00
Tell Me About Hajj by Saniyasnain Khan	295.00
The Muslim Prayer Encyclopaedia Ruqaiyyah Waris Maqsood	325.00
After Death, Life! Ruqaiyyah Waris Maqsood	195.00
Living Islam Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
A Basic Dictionary of Islam Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
The Muslim Marriage Guide Ruqaiyyah Waris Maqsood	250.00
The Beautiful Commands of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	125.00
The Beautiful Promises of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	175.00
Muhammad: A Mercy to all the Nations by Q. A. Jairazbhoy	250.00
A-Z Steps to Leadership by Abdul Ghani Ahmed Barrie	95.00
The Sayings of Muhammad by Sir Abdullah Suhrwardy	75.00
The Life of the Prophet Muhammad by Mohd. Marmaduke Pickthall	75.00

Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2000